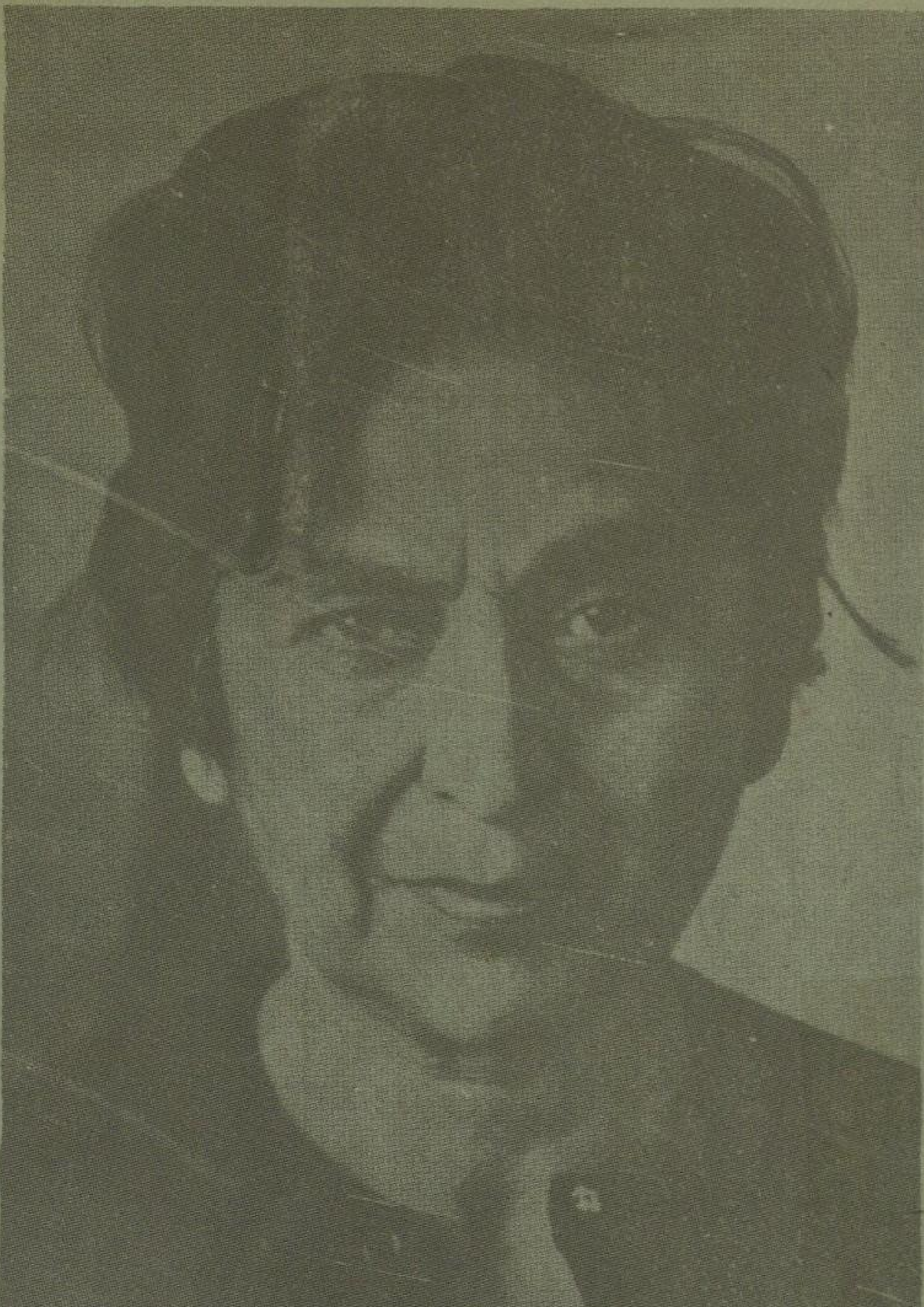
ڈاکٹر دیو



امرتا پریتم

8
A
[
0

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
Acc No: 030645
★ MAILSI ★

TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY

ڈاکٹر دیو

امرتا پریتم کی دیگر کتب

۱- ایک ہاتھ مہندی ایک ہاتھ آبلہ

۲- رسیدی ٹکٹ

۳- ایک تھی انیتا

۴- ایک لڑکی ایک جام

۵- محبت نامے

۶- میرا کمرہ

۷- ناگ منی

۸- یہ سچ ہے

۹- دلی کی گلیاں

۱۰- رنگ کا پتہ

۱۱- پانچ برس کی سڑک

۱۲- پنجر

۱۳- بلاوا

۱۴- شوقِ صراحی

۱۵- نئی قلمیں

۱۶- ایک المیہ

۱۷- انچاس دن

شاعری

۱۸- امرت لہراں

۱۹- میں جمع توں

۲۰- جیتی جاگتی زندگی

امرتا پریتم

ڈاکٹر دیو

مکتبہ اُردو اَدب
بازار ستھاں، اندرون لوہاری گیٹ، لاہور

جملہ حقوق محفوظ

ناشر سرفراز احمد
مطبع زاہد بشیر پرنٹرز لاہور
قیمت -/[illegible] روپے

ممتا کل شام سے ہی دردِ زہ کے ساتھ زور آزمائی کر رہی تھی۔ آج صبح سویرے سورج کی پہلی کرنوں کے نمودار ہوتے ہی اُس کے یہاں ایک بیٹی نے جنم لیا۔ دایہ نے پھول جیسی ننھی لڑکی کو نہلایا۔ اور نرم ریشم جیسے کپڑے میں اُسے لپیٹ دیا۔ شہد کی پہلی مٹھاس کو چاٹتے چاٹتے وہ لڑکی سو گئی۔ دایہ نے نئی ماں کے تھکن سے چُور بدن میں تازگی دوڑانے کے لئے اُس کی بیٹی کو اُس کے پہلو میں لِٹا دیا۔

"ذرا دیکھو تو سہی۔ کتنی خوبصورت ہے۔ جیسے ریشم کا تا ہو۔" دایہ نے بڑے مسرت انگیز لہجے میں ممتا سے کہا۔ لڑکے کا صرف لڑکا ہونا ہی کافی ہوتا ہے۔ مگر لڑکی کے جنم کو ایک خاص اہمیت دینے کے لئے اِس کی خوبصورتی کا

ذکر ضروری ہو جاتا ہے۔ دایہ یہ بات جانتی تھی۔

ممتا کی نگاہ لڑکی پر جمی رہی اور پھر ممتا نے آہستہ سے کہا۔

"کتنا خوبصورت ہے" کہ اس کے یہاں بیٹے نے جنم لیا ہے۔ دایہ نے درد سے تھکی ہاری ماں کا دل رکھنے کے لئے دبی زبان میں کہہ دیا "کتنا خوبصورت بچہ ہے۔ بچہ" اس لفظ سے سمجھ دار دایہ نے لڑکے اور لڑکی کے درمیان تمیز اُڑا دی۔ پھر اُس نے سوچا کہ بچی کو اُٹھا کر اُسے الگ لٹا دینا چاہیئے۔ وہ بچی کو جھک کر آہستہ سے اُٹھانے لگی۔ ممتا کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی اور کمزور ممتا بیہوش ہو گئی۔

"جگدیش" ممتا کے شوہر کا نام تھا۔ ابھی تک دایہ نے اُسے اندر نہیں آنے دیا تھا۔ ویسے وہ یہ سُن چکا تھا کہ لڑکی نے جنم لیا ہے۔ ممتا کی چیخ سُن کر سبھی گھبرا گئے۔ بوکھلائے ہوئے جگدیش نے اپنی بیوی کا سر اپنی آغوش میں رکھ لیا۔

ڈاکٹر نے ممتا کو طاقت کا انجکشن لگایا۔ لڑکی کو پیدا ہوئے ابھی صرف ایک گھنٹہ ہُوا تھا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ کمزوری کے سوا ممتا کو اور کچھ نہیں تھا۔

ممتا کو ہوش آ گیا۔ جگدیش نے اُس سے بہت پیار کیا۔ لیکن ممتا کے منہ پر خوف کا تالا لگا رہا۔ جگدیش نے اُس سے بہت پوچھا کہ کیا بات ہوئی تھی۔ کیا وہ ڈر گئی تھی۔ کیوں ڈر گئی تھی؟

بہت دیر کے بعد ممتا نے صرف ایک بار اتنا کہا کہ دایہ اُس کے بیٹے کو اُٹھا کر لے چلی تھی۔ جگدیش ہنستا رہا۔ ڈاکٹر ہنستا رہا۔

"یہ رہا تمہارا" ڈاکٹر نے ننھی سی لڑکی کو اِس کی چارپائی پر ڈال دیا۔

جگدیش بہت حیران ہو رہا تھا۔ اس کے دل میں کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ اس کی اتنی باشعور بیوی بیٹے کی جگہ بیٹی کے جنم کو اس قدر محسوس کرے گی۔ ممتا تو ایک سمجھدار لڑکی تھی۔ باتوں باتوں میں جگدیش کئی بار محسوس کیا کرتا تھا کہ ممتا زندگی کے ہر ایک پہلو پر بحث کر سکتی ہے۔ سماج اور سیاست کے ان گنت موضوع اس کی گفتگو کا حصہ ہوا کرتے تھے۔ اتنی خوبصورت اور دانشمند لڑکی کے رو برو کئی بار اپنے آپ کو بہت پست قامت محسوس کیا کرتا تھا۔ جگدیش کے خاندان میں ایسی شان اور عظمت کی اور کوئی لڑکی نہیں تھی۔

آج جگدیش حیران تھا کہ بیٹے کے جنم کا خیال ممتا کے باطن میں کیوں سمایا ہوا تھا۔ ڈاکٹر جگدیش کو سمجھاتا رہا کہ کئی بار لڑکے اور لڑکی کے درمیان امتیاز کا خیال صرف پرانے اثرات کا نتیجہ ہی نہیں ہوتا اور نہ ہی لڑکی کو گھٹیا اور لڑکے کو بڑھیا سمجھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ بلکہ علم انسان کے مطابق کئی بار عورت بیٹے یعنی مرد کو جنم دینے میں اطمینان تلاش کرتی ہے۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ کچھ دنوں کے بعد جب ممتا اچھی بھلی ہو جائے گی تو اس امتیاز کو خود ہی ختم کر دے گی۔ ابھی اس کے کمزور بدن کو اس خیال میں مگن رہنے دو کہ یہ لڑکا ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ ممتا ایک پل کے لئے بھی اس لڑکی کو اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی تھی۔ دایہ اس کی آنکھوں کے سامنے بچی کو نہلاتی، دودھ دیتی، سلاتی اور کھلاتی۔

کتنے ہی دن گذر گئے۔ ڈاکٹر نے اجازت دیدی کہ اب ممتا تھوڑا بہت چل پھر سکتی ہے۔ بچی کو گاڑی میں سیر کرائی جا سکتی ہے لیکن ایک دو بار پھر

وہی بات ہوئی۔ ایک دن اپنی کوٹھی کے باغیچہ میں ممتا اپنی بچی کو ہتھ گاڑی میں سیر کرا رہی تھی اور جگدیش ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ شام کی ٹھنڈک پھیل رہی تھی اور رات کی رانی کی سوندھی سوندھی خوشبو بھی آ رہی تھی۔ ممتا کے سُرخ دوپٹہ میں کامی اور باریک دھاریاں ممتا کے چہرے کو اور بھی تابناک بنا رہی تھیں۔

اتنے میں آیا آئی اور اُس نے ہتھ گاڑی ممتا سے لے لی۔ بچی کو دودھ دینے کا وقت ہو گیا تھا۔ آیا نے ابھی اپنی پیٹھ موڑی ہی تھی کہ ممتا کا رنگ اُڑ گیا۔ وہ نڈھال ہو کر بنچ پر بیٹھ گئی۔ جگدیش نے اُسے سہارا دیئے رکھا۔ ممتا بے سُدھ ہو گئی "وہ لے گئی۔ وہ لے گئی۔ میرے بچے کو لے گئی۔"

ڈاکٹر نے جگدیش کو سمجھا رکھا تھا کہ کسی طرح بچے کی موت کا ڈر اس کے دل میں بیٹھ گیا ہے۔ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا۔ جگدیش بالکل نہ گھبرایا اُسے خیال گذرا کہ آیا کو تبدیل کر کے دیکھنا چاہیے۔ شاید ایک خاص قسم کے چہرے کے باعث ممتا کے دل میں ڈر بیٹھا ہو۔ ننھی بچی کا نام رکھنا تھا ابھی تک تو سب اُسے "بے بی" کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ ننھی لڑکی جب کئی بار ممتا کے ساتھ لیٹی ہوئی ہوتی تو ممتا اُسے "رنجو" کہہ کر بلایا کرتی۔ گھروں میں ویسے بھی لڑکیوں کا نام رکھنے کی اتنی فکر نہیں ہوتی۔ جگدیش تو ممتا کی چھوٹی سے چھوٹی خواہش کو بھی پورا کر دیا کرتا تھا۔ دھیرے دھیرے سب کی زبان پر بچی کا نام "رنجو" پک گیا۔

آیا تبدیل کر دی گئی۔ پہلی آیا کے جیسے خدو خال تھے۔ اُن سے بالکل

مختلف ناک نقشے اور رنگ والی آیا جگدیش نے منتخب کی۔ لیکن ممتا کی حالت میں کوئی خاص فرق نہ پڑا۔

ایک دن ممتا اپنے کمرے میں بیٹھی تھی۔ جاڑوں کی ہلکی ہلکی سردی پڑ رہی تھی۔ "رنجو" سو چکی تھی۔ جگدیش اپنے کسی دوست کے ہمراہ فلم دیکھنے گیا ہُوا تھا۔ ممتا کمبل کا ایک کنارا پیروں پر لپیٹ کر پلنگ پہ بیٹھی ہوئی تھی شام کافی گہری ہو چکی تھی۔ ممتا نے کمرے کی بجلی تک نہ جلائی۔ رنجو کا جو سویٹر اُس نے شروع کر رکھا تھا وہ بھی دُور میز پہ پڑا ہُوا تھا۔ سامنے سردیوں کا ٹھنڈا اور زرد چاند نکلا ہُوا تھا اور درختوں کی جھریوں میں سے جھانک رہا تھا۔ ممتا نے کوئی کھڑکی بند نہ کی اگرچہ چاند کی ہلکی چاندنی کے ساتھ ساتھ سردی بھی کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ ممتا بیٹھی رہی۔

ممتا سوچتی رہی یہ زندگی شاید ایک بند کمرے کی طرح ہوتی ہے۔ جس کی ایک کھڑکی قدرت کی وسعت کی طرف کھلی رہتی ہے۔ اور اس سے کبھی کسی چاند کی جھلک، کسی اندھیرے کی سیاہی، کبھی آنکھیں چُندھیا دینے والا اُجالا، سیاہ تاریکیاں، لُو، ہوا یعنی اچھا اور بُرا لگتا ہُوا ہر ایک منظر زندگی کے اس کمرے میں آتا رہتا ہے۔ فرق ہے تو صرف اتنا ہے کہ اس کھڑکی کو کھولنا یا بند کرنا اپنے بس کی بات نہیں۔

کمرے میں ہلکی ہلکی سردی پھیلتی جا رہی تھی۔ چاند بھی کھڑکی کے سامنے سے ذرا ہٹ گیا تھا۔ سردی کے باعث کمرے کا اندھیرا بھی گہرا ہو گیا۔ چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں سے بھلا کتنی دیر تک اُجالا اندر آ سکتا ہے چونکہ ادرگرد تو دیواریں ہی دیواریں ہیں!

ممتا کا جی چاہا کہ دیواروں میں لپٹے ہوئے زندگی کے کمرے میں جو تھی

سی کھڑکی تھی - وہ بند ہو جائے - جس میں سے بیرونی اُجالا خواہ مخواہ آتا تھا یا روشنی اندھیرا آتا اور جب رات کو ممتا سو جاتی تو خوابیدہ جسم میں کوئی چیز بیدار ہوتی - جسم تو پلنگ پر ہی پڑا رہتا - لیکن وہ بیدار چیز پلنگ سے اُٹھ کھڑی ہوتی اور زندگی کی سدا کھلی رہنے والی اس کھڑکی سے نکل کر قدرت کی وسعت میں گم ہو جاتی - گھومتے گھومتے، بھٹکتے بھٹکتے ہوا کی رفتار سے وہ چیز کچھ ڈھونڈتی رہتی - سوئی پڑی ممتا کا دل دھک دھک کرتا رہتا - لیکن بیدار ہونے والی وہ چیز ارادی یا غیر ارادی طور پر زندگی کی سدا کھلی رہنے والی اس کھڑکی کو استعمال کرتی رہتی -

ممتا کا جی چاہا کہ دیواروں میں لپٹے ہوئے زندگی کے کمرے کی وہ ننھی کھڑکی بند ہو جائے - راتوں کے سپنے جن میں بہت مٹھاس ہوتی اور انتہا درجہ کی تلخی ہوتی ختم ہو جانے چاہئیں - اُسے کمرے کے باہر کا کوئی منظر نظر نہ آئے - وہ کمرے ہی سے دل بہلائے - کمرے کی دیواروں ہی سے دل بہلائے کمرے کی ہر ایک چیز سے باتیں کرے اور اس طرح وہ کمرے ہی کی کوئی چیز بن جائے .....

.... لیکن زندگی کی اس کھڑکی کو بناتے ہوئے خدا اُس میں پٹ لگانے بھول گیا تھا - اور اس طرح دیواروں میں لپٹی ہوئی زندگی کی وہ ننھی سی کھڑکی ہمیشہ کے لئے کھلی رہ گئی تھی - یہ کھڑکی ممتا کی زندگی میں کیونکر بند ہوتی - یوں انسان کے آج تک کے تصور اور دلوں کی تاریخ رقم کرنے والے قلم سے جو سپنوں بھری زبان بر آمد ہوتی ہے - ان سب کی خالق یہی کھڑکی ہے - جس سے باہر نکل کر انسان کے سنبھال اور لپیٹ کر رکھے ہوئے خیالات قدرت کی وسعت میں گھوم سکتے ہیں اور بھٹک سکتے ہیں - ممتا کھڑکی کے

باہر پھیلتی اور گہری نظر سے دیکھتی رہی۔

سردیوں کی دوپہر تھی۔ گرم گرم کرنیں کھڑکی سے گذر کر کمرے کے سُرخ قالین پر گِر رہی تھیں۔ ممتا نے سفید ساری باندھ رکھی تھی۔ سفید دیوار کے سہارے وہ بے خیالی کے عالم میں کھڑکی کے پاس کھڑی تھی۔ کھڑکی کے نیچے مہک چھوڑتے پھولوں کا ایک گوشہ تھا۔ ممتا اس طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ سردیوں کے سُورج کا زرد اُجالا تو پھیلا ہُوا تھا۔ لیکن آسمان پر اور کچھ بھی نہیں تھا۔

جگدیش جب کمرے میں داخل ہُوا تو ممتا اُسے اُس سفید دیوار کا ہی ایک حصہ نظر آئی۔ خاموش، بے خبر۔ پتھر کی دیوار۔

"ممتا۔!"

ممتا کھڑکی سے ہٹ کر جگدیش کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ نہ جانے ممتا نے آسمان کی وسعتوں سے اپنی آنکھوں میں کیا کچھ بھر لیا تھا کہ جگدیش کو اس کی آنکھوں میں ایک بیگانگی سی نظر آئی۔

"ممتا۔ تمہاری آنکھوں میں کیا ہے۔؟"

"کیا آج ہی یہ آنکھیں دیکھی ہیں۔ یا پہلے بھی کبھی دیکھی ہیں؟"

"ان میں کچھ اچھا ہے یا بُرا۔؟"

"نہایت ڈراؤنا!"

"اچھا۔ کیا ڈر لگتا ہے۔؟ ڈر لگنا ہی چاہیئے۔" ممتا ہنس پڑی۔

"لیکن یہ کیا ہے۔؟"

"سایہ"

"کس کا"

"زندگی کا"

"میں پہیلیاں بیان نہیں کرتا اور نہ ہی بجھارتوں کا حل ڈھونڈتا ہوں مجھ جیسے سیدھے سادھے آدمی کے ساتھ سیدھی سادی باتیں کیا کرو"

"مگر تقدیر کی لکیر ہمیشہ سیدھی تو نہیں ہوا کرتی" ممتا کے چہرے پر بے توجہی کے آثار پیدا ہو گئے۔

"آؤ۔ میں ان ہاتھوں سے پوچھوں کہ وہ میری تقدیر کا خط سیدھا کھینچیں گے یا نہیں۔؟"

بالکل غلط۔ یہ ہاتھ ایسے کہاں ہیں کہ تقدیر کے خط کھینچ سکیں۔ میرا تو خیال ہے کہ کسی کیڑے کے پیروں میں سیاہی لگا کر اسے چھوڑ دیا جائے تو وہ خود ہی ٹیڑھا بینگا چلتا ہوا الٹی سیدھی لکیریں کھینچتا جائے گا۔ یوں ہی خدا کا ہاتھ آدمی کی قسمت لکھتا ہے"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی"

"میں کب کہتی ہوں کہ یہ کوئی بات ہے"

"تم خوب جی بھر کے ایک گتھی بنتی جاؤ۔ مگر میں اسے کھول لوں گا"

"خدا جس طرح رکھے اسی طرح رہنا چاہیئے۔ خواہ مخواہ تقدیر میں دخل نہیں دینا چاہیئے"

"ممتا یہ بات تم کہہ رہی ہو کہ خدا جیسے رکھے ویسے ہی رہنا چاہیئے؟ کبھی کبھی تم کہا کرتی ہو کہ آدمی کے عمل سے وہ آگ پیدا ہوتی ہے۔ جو سماج

کی غلط قدروں کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیتی ہے۔ کبھی تو تم خدا کو، دُنیا کو، تہذیب و تمدن کو، قانون کو اپنی باتوں سے نوچ ڈالتی ہو۔ اور کبھی تم کہتی ہو خدا جیسے رکھے ویسے رہنا چاہیے۔ یوں تو بات کہنے کو تمہاری ہر ایک ادا بہت حسین ہوتی ہے۔ مگر تمہاری ہر ایک بات متضاد ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کے اُلٹ۔"

"میں خود بھی تو ایک دن دوسرے دن سے اُلٹی ہوتی ہوں۔"

"کبھی تم رنجو سے الگ نہیں ہوتی تھیں۔ لیکن کبھی تمہاری لاپروائی کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ اور رنجو تو سدا رنجو ہی ہے۔"

"نہیں۔ رنجو سدا ایک جیسی رنجو نہیں۔ کبھی رنجو میرا اپنا ہوتا ہے۔ اور کبھی رنجو تمہاری رنجو ہوتی ہے۔" یہ کہتے ہوئے ممتا کا چہرہ حیا سے سُرخ ہو گیا۔

"تمہاری رنجو میری رنجو ہے اور میری رنجو تمہاری رنجو ہے۔"

"میرا رنجو۔" ممتا بول اٹھی۔ "میرا رنجو نہ جانے کہاں ہے۔" ممتا کی کپکپی دُور ہو گئی۔ صحت مند، طاقتور اور بہادر سپاہی کی طرح وہ تن کر کھڑی ہو گئی۔

"تم سمجھتے ہو شاید میں پاگل ہوں مجھے ہسٹریا ہے۔ مجھے سَوت کا کوئی روگ ہے۔ مجھے کچھ بھی نہیں ہے۔ میں کسی رنجو کی بدنصیب ماں ہوں۔"

"ممتا تمہارا دماغ۔"

"نہیں۔ نہیں۔ مجھے کچھ بھی نہیں ہُوا۔ میرا دماغ خراب نہیں۔ میری قسمت ضرور خراب ہے۔ تم روز پریشان ہوتے ہو۔ مجھے اپنے آپ سے زیادہ تم پر ترس آتا ہے۔"

"ممتا!"

"میں تمہارے ساتھ شادی کرانے سے پہلے کنواری نہیں تھی۔ میں بیوی ہی نہیں بنی تھی۔ بلکہ ایک بچہ کی ماں بھی۔"

جگدیش نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ جیسے ناگزیر تصادم کے دوران انسان فولاد کی طرح مضبوط ہو جاتا ہے "کیا تمہارا وہ شوہر زندہ نہیں ہے؟"

"زندہ ہے۔ اس کا نام ہے دیوراج۔ اس وقت وہ ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر رہا تھا"

تم شاید یہ جاننا چاہو کہ وہ کہاں ہے۔ اس کی مجھے بھی خبر نہیں ہے۔ میرا وہ بیاہ ماں باپ نے نہیں کیا تھا۔" ممتا ہنسنے لگی "وہ بیاہ میں نے خود کیا تھا۔ وہ بیاہ غلط تھا۔ گناہ تھا۔ جو کچھ بھی تھا۔ مگر میں نے وہ خود کیا تھا۔ اس کے اچھے یا بُرے ہونے کی ذمہ داری میں تھی۔ میرے یہاں بچہ ہونے والا تھا۔ ماں باپ نے ہماری التجائیں ٹھکرا دیں۔ ہماری آہ و زاری کی پرواہ نہ کی میری آنکھوں پر دیواروں کی پٹی باندھ دی گئی۔ میں اس کی صورت نہ دیکھ سکی۔ میرا بچہ پیدا ہوتے ہی مجھ سے چھین لیا گیا" ممتا کے دل میں تشدد اور عدم تشدد کے جذبات پیدا ہو رہے تھے۔

جگدیش کو یوں محسوس ہوا جیسے گرم گرم لاوا اس کے جسم پر دوڑ رہا ہو۔ یہ لاوا ٹھنڈا پڑتا گیا۔ جمتا گیا اور منجمد شیشے کی طرح جگدیش بُت بنا بیٹھا رہا۔

ممتا نے اپنے بازو جگدیش کے گلے میں ڈال دیئے اور پھر بولی۔ دراصل کیا میں، کیا تم اور کیا کوئی اور۔ سب کے سب حربے ہیں۔ ہم عمل ضرور ہیں۔ مگر خالق نہیں ہیں۔ توڑنے اور تراشنے کے ذمہ دار حربے نہیں ہوا کرتے۔ ہتھیاروں کو چلانے والے ہاتھ دراصل ہمارے مقدر ہیں"

ممتا کی باتیں لوہے کی گرم گرم سلاخوں کی طرح جگدیش کے بدن میں گھستی جا رہی تھیں۔ وہ تڑپ کر اُٹھ کھڑا ہوا" ممتا یہ باتیں تم نے

مجھے پہلے کیوں نہ بتائیں؟"

"کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔"

"کیا صداقت کو صداقت کی ضرورت نہیں تھی۔"

"میرے دل کو ختم ہوئے ایک مدت ہو چکی ہے۔ اب میرے لئے جھوٹ اور سچ دونوں برابر ہیں۔"

"تو پھر آج یہ بات کیوں بتا رہی ہو۔؟"

"سچ اور جھوٹ کیونکہ دونوں برابر ہیں۔ اس لئے جھوٹ بولا تو پھر کیا ہوا اور اگر سچ بول رہی ہوں۔ تو پھر کیا ہے۔ مگر تم بھول رہے ہو۔ میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ میں نے تم سے کبھی یہ نہیں کہا کہ میں تم سے پیار کرتی ہوں۔"

"تمہیں معلوم نہیں ممتا۔ کہ تم اس آباد گھر کو کس طرح تباہ کر رہی ہو۔"

"تم یہ بات اُس سے پوچھ رہے ہو جو تباہی کا شکار ہو چکی ہے۔"

"یہ رنجو بھی تم سے جدا ہو سکتی ہے۔" جگدیش کو رنجو کی پیدائش کی گھڑی یاد آگئی تھی۔ شاید ممتا کے دل میں وہ پہلا ڈر بیٹھا ہوا تھا کہ بچہ پیدا ہوتے ہی اس سے چھین لیا جائے گا۔ اسی لئے وہ ڈرتی ہوئی بیہوش ہو گئی تھی اور سہم گئی تھی۔

"وہ رنجو بھی چلا گیا۔ یہ رنجو بھی چلی جائے۔"

"تمہیں اس رنجو سے کیا پیار نہیں؟"

"میرا دل تو چاہتا ہے کہ میں کہہ دوں۔ بالکل نہیں۔ وہ رنجو میرے پیار کا دھڑکتا ہوا بُت تھا اور یہ رنجو زبردستی کا ایک پتھر ہے۔ جسے میں نے مہینوں اپنے پیٹ میں ڈھویا ہے۔"

"میں نے تم سے کبھی کوئی زبردستی نہیں کی!"

"تم تو ایک حربہ ہو۔ تقدیر کا۔ تم خالق نہیں ہو۔ خالق تو وہ سماج ہے۔ جس نے میری محبت کو قدموں تلے روند دیا ہے۔"

"کیا تم نے سماج سے بدلہ لیا ہے۔؟"

"بالکل نہیں۔ میں نے یہ کبھی نہیں چاہا تھا کہ میں کوئی اور شوہر منتخب کروں کسی اور بچے کو جنم دوں۔ سماج نے خود میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اس راستہ پر ڈال دیا ہے۔"

"لیکن تم سماج سے اپنا ہاتھ چھڑا سکتی تھیں۔"

"کاش تمہیں معلوم ہوتا سماج کے ہاتھ کتنے زبردست فولادی پنجے ہوتے ہیں۔"

"لیکن فولادی پنجوں سے زیادہ زبردست ہاتھ اس دُنیا میں پیدا ہوتے ہیں۔"

"میں مانتی ہوں۔ بھنور میں پھنس جانا انسانی کمزوری ہے لیکن کنارے پر بیٹھ کر پانی کے بھنور کا اندازہ نہ لگاؤ۔ غوطہ لگا کر دیکھو۔"

"ممتا۔ کیا تمہارے راستہ میں مجھے ہی حائل ہونا تھا؟"

"جب بگولا اُٹھتا ہے تو کسے خبر ہوتی ہے کہ کون سی مٹی کون سے راستہ پر جا بیٹھے گی۔"

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارا وہ شوہر کہاں ہے؟"

"نہیں مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ مجھ سے اب شادی نہیں کروانا چاہتا تھا میں اُس سے پھر کبھی مل نہ سکی۔"

"کیا تمہیں اب اُس سے پیار نہیں ہے۔؟"

"میں نے تو اُس سے پیار کیا ہے۔ اُس کے سوا اور کسی سے پیار نہیں

کیا۔ لیکن میں اُس سے ملنا نہیں چاہتی۔"

"شاید اب تک اس کا بیاہ ہو چکا ہو۔؟"

"شاید۔"

"جسے تم پوجتی ہو شاید وہ بت ٹوٹ چکا ہو۔"

"ٹوٹا ہو یا ثابت۔ مجھے اب کسی بُت کی ضرورت نہیں۔ وہ میری رگ رگ میں سما چکا تھا۔ اس کی کپکپاہٹ ابھی تک میرے بدن میں موجود ہے۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہُوا تمہارا پیار ابھی تک زندہ ہے۔"

"پیار مرنا نہیں جانتا۔"

"ممتا تم اُسے ڈھونڈ سکتی ہو۔ میں تمہارے راستہ کی رکاوٹ نہیں بنوں گا۔"

"میں اُسے ڈھونڈنا نہیں چاہتی۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ اب اُسے میری کوئی ضرورت نہیں۔ میں کندھوں پر ڈھویا جانے والا بوجھ نہیں۔ میں تو اُس کے قدموں کے ساتھ قدم ملا کر چل رہی تھی۔ قدم بچھڑ گئے اور ہمارا ساتھ ٹوٹ گیا۔"

"ممتا۔ کیا تم ان الفاظ کا مطلب پوری طرح سمجھتی ہو؟"

"ہاں۔ اس کا مطلب ہے کہ اگر تم مجھے بوجھ سمجھتے ہو تو میں کبھی تمہارے کندھوں پر سوار ہونے کے لئے تیار نہیں ہوں۔"

"تمہارا وہ بچہ کس حال میں ہے؟"

"مجھے کیا خبر۔ اُسے کسی اسپتال کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ ہسپتال کی لیڈی ڈاکٹر نے مجھ سے دس دن کے لئے اُسے دُودھ پلانے کو کہا تھا۔ تاکہ وہ بچہ زندہ رہ سکے۔ مَیں نے دس روز تک اُسے اپنی چھاتی سے

لگایا تھا۔ اس کے بعد کی مجھے کوئی خبر نہیں کہ زندگی کا بگولا اُسے کہاں لے گیا۔ مجھے کچھ بھی معلوم نہیں۔"

"یہ رنجو تمہاری بچی ہے۔ تمہیں اس رنجو سے جدا ہونا پڑے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارا اثر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"تم جو کہو گے۔ میں کرنے کے لئے تیار ہوں۔"

"تم جتنا روپیہ چاہو۔ میں تمہیں دے سکتا ہوں ہر مہینے بھیج سکتا ہوں لیکن رنجو کو کبھی یہ پتہ نہ چلے کہ تم اس کی ماں ہو۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم مجھ سے کوئی الگ راستہ اختیار کرنا چاہتے ہو۔ میں نے تم سے ابھی کہا تھا کہ میں کندھوں پر ڈھویا جانے والا بوجھ نہیں ہوں۔"

"مجھے تم سے ہمدردی ہے ممتا۔"

"پانی کے تیز دھارے میں ڈوبتے ہوئے دو اشخاص کو ایک دوسرے سے ہمدردی ہوا ہی کرتی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ نینی تال میں میری کوٹھی تمہیں پسند ہو گی۔" جگدیش کا جی چاہا کہ وہ لاہور چھوڑ جائے۔ ماں باپ کو چھوڑ جائے۔ رنجو کو چھوڑ جائے اُن کا مستقبل اُن کے حوالے کر جائے۔ وہ ممتا کو اپنے ساتھ لے کر کہیں نکل جائے وہاں جہاں اس کا ضمیر اُسے ملامت نہ کر سکے۔ جہاں ممتا کا پہلا پیار نہ اُبھرے اس کے اپنے پرانے جذبات بیدار نہ ہوں۔ جہاں صرف وہ ہو اور ممتا ہو۔

"مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ میں نے تمہیں بیوی کی حیثیت سے کچھ دیا ہی نہیں۔ اگر میں نے کچھ دیا بھی ہوتا تو میں اپنی نسائیت یا زوجیت کو ہرگز نہ بیچتی ہر مہینہ کا خرچ بیتی ہوئی ازدواجی زندگی کے نام پر بطور خیرات نہ مانگتی میں

خوش ہوں۔ اس رنجو کی تو مجھے کوئی خبر نہیں۔ لیکن اس رنجو کے بارے میں مطمئن ہوں۔ تمہارے ہاتھ اس کے سر پر ہیں۔" ممتا گذشتہ دنوں کی نسبت زیادہ پُر سکون اور گذشتہ دنوں کی نسبت زیادہ حسین جگدیش کے پہلو سے اُٹھی۔ اس نے نظر بھر کر جگدیش کی طرف دیکھا اور چپکے سے چلی گئی۔

جگدیش کا جی چاہا کہ وہ ممتا کو پکڑے۔ اپنی آغوش میں بھینچ لے اور چیخ اُٹھے۔ "مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ میرا اور تمہارا راستہ ایک ہے۔" لیکن جگدیش بُت بنا بیٹھا رہا۔ اس کی زبان پتھر کا ایک ٹکڑہ بن کر رہ گئی۔ اُس وقت تک شاید ممتا کوٹھی کا بیرونی پھاٹک بھی پار کر چکی تھی۔

ممتا نے ایک گورنمنٹ اسکول میں ملازمت کر لی۔ اسکول کے عملہ کے لئے مخصوص کوارٹروں میں اُسے ایک کمرہ مل گیا۔ اسکول کے کوارٹر میں وہ رہتی۔ اسکول کے ہوسٹل میں وہ کھانا کھاتی۔ اسکول کے کلاس روم میں وہ بچوں کو پڑھاتی۔ اسکول کی لائبریری میں مطالعہ کیا کرتی۔ پانچ حروف کے لفظ اسکول نے اُسے مول لے لیا تھا۔

اپنے کمرے میں چارپائی کے سرہانے کی طرف دیوار کا سہارا لئے ہوئے وہ ادھ لیٹی اور ادھ بیٹھی ہوئی تھی۔ کمرے کی کھلی کھڑکی میں سے چاند کی روشنی کمرے کے نصف فرش تک آ رہی تھی۔ اس نے بجلی بجھا رکھی تھی۔

ہلکے نیل سے پوتی ہوئی کمرے کی دیواریں بڑی نرم محسوس ہو رہی تھیں ممتا اِن دیواروں کی طرف دیکھتی رہی۔ دیکھتی رہی۔ نرم دیواریں اور بھی

نرم ہو گئیں اتنی نرم جیسے آنکھوں کو صاف نظر آرہا ہو۔ چار سو پُر سکون اور نیلا پانی بہہ رہا ہو۔ پُر سکون دریا شانت مہا ساگر۔ اُسے یوں محسوس ہُوا جیسے اُس کی چارپائی ایک ناؤ کی طرح دھیرے دھیرے پانی کے بہاؤ پر چل رہی ہو۔ جیسے اس ناؤ میں اکیلی اور تنہا ممتا پانی کے دائیں پانی کے بائیں، پانی کے آگے، پانی کے پیچھے، پانی کی چھاتی پر بڑے آرام سے بیٹھی ہو۔ ہلکی لہروں میں بالکل پُر سکون اور مطمئن ۔

اندھیرے سے جب آنکھیں مانوس ہو جاتی ہیں تو گھور اندھیرے میں بھی دھیرے دھیرے کچھ چیزیں آنکھوں سے شناسا ہو جاتی ہیں۔ ممتا کو یوں معلوم ہوا جیسے پانی سے دُور کناروں پر کچھ آدمی حرکت کر رہے ہیں۔ جن کے چہرے پوری طرح نظر نہیں آرہے۔ اندھیرے کا غبار چھٹتا رہا منظر صاف ہوتا گیا۔ ممتا نے دیکھا کہ وہ دیو کا چہرہ تھا۔

دیو کا چہرہ ہمیشہ کی طرح صاف ستھرا تھا۔ لمبے قد کے اوپر اُس کا چہرہ یوں ہی دمک رہا تھا۔ فرقت کی آنچ نے اُس کے خدوخال کو پگھلا کر اور بھی نرم بنا دیا تھا۔ جس کے باعث دیو پہلے سے ذرا اُجلا نظر آرہا تھا۔ ممتا کی نگاہیں اس کے چہرے پر گڑی رہیں۔ پیالہ کی آنچ ابھی تک دیو کے چہرے پر موجود تھی۔ وہ آنچ ممتا کی آنکھوں میں بھی پڑ رہی تھی۔ آنکھوں میں حرکت پیدا ہوئی۔ وہ پگھل گئیں پلکیں جھک گئیں اور دیو کے قدموں میں جھکی رہیں آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے گرے اور ممتا نے کہا۔ "الوداع، میرے دیو الوداع۔ جی چاہتا ہے یہ بندھی ہوئی کشتی کھل جائے۔ میں کنارے جا لگوں تمہارے پاس پہنچ جاؤں۔ لیکن مجھ میں ہمت نہیں۔ پانی کی لہر مجھے کنارے سے دور لے آئی ہے۔ کشتی اور کنارے میں فاصلہ بڑھ گیا ہے۔ الوداع۔ دیو الوداع"

دیو کا بُت پیچھے رہ گیا۔ ممتا دیکھتی رہی۔ بُت میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ

جیتا جاگتا انسان بن گیا۔ ممتا نے اُس کو پہچان لیا۔ وہ جگدیش تھا۔ ممتا نے ایک لمبا سانس لیا۔ جگدیش کے چوڑے ماتھے پر غم کی سلوٹیں اور بھی اُبھر آئی تھیں۔ ہونٹ پہلے سے زیادہ سفید ہو گئے تھے۔ جگدیش نے آنکھیں پھاڑ کر ممتا کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں پیار تھا، شکوہ تھا۔ ہمدردی تھی۔ لیکن غم واندوہ کی کسک اس کی آنکھوں میں بہت نمایاں تھی۔ اس نمایاں کسک پر بھی ایک اور پرچھائیں پھیلی ہوئی تھی۔ یہ ایک آرزو۔ ایک تمنا کی پرچھائیں تھی۔ ممتا سے اس کی طرف دیکھا نہ گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ ممتا کے دل سے ایک آواز اُٹھی :۔

مجھے معاف کر دو مجھے معاف کر دو۔ میں تمہیں بھلا کیا دے سکتی ہوں دیکھ لو میری آغوش خالی ہے۔ میرے ہاتھ خالی ہیں۔ میں اپنی ساری پونجی لٹا چکی ہوں۔ تم موتیوں کے سوداگر تھے۔ میں کنگال ہو کر تمہارے پاس آئی۔ ٹوٹے پھوٹے منکے، سستی سیپیاں، پھوٹی کوڑیاں ہیں انہیں آپ کے روبرو رکھتے ہوئے شرما گئی۔ میری غریبی شرما گئی۔ میں نے تمہیں بتا دیا کہ میں نادار ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔ معاف کر دو" ممتا نے اپنا سر جھکا لیا۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنی شرمسار آنکھیں جگدیش کے سامنے اُٹھا نہیں سکتی تھی۔ ممتا نے سر جھکائے رکھا۔

ناؤ چلتی رہی۔ کنارے کے گل و بوٹے، پھول پتّے۔ کناروں کے پتھر اور کنکر۔ سب کچھ پیچھے رہ گیا۔ جگدیش کا بُت بھی اب پیچھے رہ گیا تھا۔ ممتا نے سر اُٹھایا۔ کنارے کی گیلی ریت میں ایک بچہ کھڑا تھا۔ یہ ایک مٹھی بھر مٹی اور چلّو بھر لہو کا بنا ہوا ایک لڑکے کا بُت تھا۔ اور ممتا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے ایک ننھا بچہ اجنبی چہرہ دیکھ کر اُسے پہچاننے کی کوشش کرتا ہے ممتا کانپ اُٹھی۔ اس نے سر جھکا لیا۔ ناؤ پانی کی ہموار لہروں پر تیرتی رہی۔ ہلکوروں کی وجہ سے

ممتا اُونگھنے لگی۔ ہوا پانی کے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہی تھی اور پانی مرتعش تھا۔ لہروں میں ایک ہلکا راگ چھڑا ہوا تھا۔ ممتا چونک پڑی۔ کنارے پر ایک بچہ کے رونے کی صدا آئی۔ ممتا نے دیکھا۔

ایک ننھی سی لڑکی کنارے پر گھٹنوں کے بل چل رہی تھی۔ شاید اُسے مٹی ٹھنڈی لگ رہی تھی کہ زمین پر کوئی چیز چبھ رہی تھی۔ وہ روتے روتے لڑھک رہی تھی۔ ممتا ڈر گئی۔ لڑکی لڑھکتے لڑھکتے پانی میں گر پڑے گی ممتا نے گھبرا کر دونوں بانہیں پھیلا دیں کہ اُسے دبوچ لے۔ اُسے اُٹھائے۔ اُسے چپ کرائے جھاڑ پونچھ کر اُسے گود میں اُٹھائے۔ ممتا کی بانہیں پھیلی رہ گئیں۔ کنارا بہت دُور تھا وہ بچی بہت دُور تھی۔ دریا بہت چوڑا تھا۔ ناؤ آگے بڑھ رہی تھی۔ بچی لمحہ بہ لمحہ پیچھے رہتی جا رہی تھی۔ آنکھیں دیکھتی رہیں۔ پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتی رہیں۔ آنکھوں سے اندھیرا بھی چھٹ گیا تھا۔ آنکھیں مجبور ہو کر رہ گئیں۔ پانی کی دھار اور ناؤ کی رفتار کے آگے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ ممتا کو مجبوراً سامنے کی طرف دیکھنا پڑا۔ وہ دیکھتی رہی۔ کنارے پر بہت سے بُت نظر آئے۔

ممتا کی ماں۔ ممتا کا باپ، ممتا کا بڑا بھائی۔ ممتا کی بڑی بہن، گھٹنوں کے بل جھکے ہوئے تھے۔ اِن چاروں کے سروں پر کچھ سائے مسلط تھے۔ اِن سایوں کے چہرے کوشش کے باوجود پہچانے نہیں جاتے تھے۔ ممتا کو بڑے غور سے دیکھنا پڑا۔ پھر اُس نے یہ اندازہ لگایا کہ وہ اس کی ماں کی ماں ہوگی۔ وہ اس کے ابا کا ابا ہوگا۔ اور شاید ان کے بھی دادا پڑدادا ہوں گے۔ برسوں اور صدیوں کے بیتنے سے ان کے چہروں پر جھریاں پڑ گئی تھیں۔ مگر سب روہانسے ہو رہے تھے۔ رو رہے تھے۔ سرنگوں تھے اور شرمسار تھے۔ ممتا نے سب کو ایک بار دیکھا اور پھر اپنا منہ پھیر لیا۔

کنارے سے حلق میں اٹکی ہوئی اور آنسوؤں میں بھیگی ہوئی کچھ آوازیں آئیں "بیٹی ہمیں معاف کر دو۔ بہن ہمیں معاف کر دو۔ ہم گنہگار ہیں۔ قاتل ہیں"۔ آوازیں اُن کے حلق میں رُک گئیں۔ اُن کے آنسوؤں میں سما گئیں۔ ممتا سر سے پاؤں تک نڈھال ہو گئی۔ دائیں ہاتھ سے اُس نے اپنا ماتھا تھام لیا۔ اس کے ہونٹوں سے ایک سرد اور گہری آہ نکل گئی۔ پھر اُس نے آہستہ سے مگر صاف آواز میں کہا۔" بھگوان تمہیں معاف کرے"۔

اب ناؤ پھر اُسی طرح چلتی رہی۔ بہت دیر ہو گئی۔ ممتا نے سر اُٹھا کر کنارے کی طرف نہ دیکھا۔ خبر نہیں کناروں پر نئے شگوفوں سے لدے ہوئے پیڑ تھے کہ سوکھی اور جلی ہوئی جھاڑیاں تھیں۔ خاموشی بہت بھیانک تھی۔ میلوں تک ویرانی ہی ویرانی سب کچھ منجمد۔ برف ۔ جس میں کوئی بھی جاندار شے نہیں تھی۔ کوئی بھی جانور اور پنچھی نہیں تھا۔ پرندے بھی جیسے برف میں جم گئے تھے۔ کوئی آواز نہیں۔ زندگی کے آثار نہیں۔

پھر کنارے پر شور و غل اُٹھا۔ کان پڑی آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی شہر یا کوئی وادی آ گئی ہے۔ بچوں کے نانے، بچوں کی ہنسی۔ نوجوانوں کی باتیں۔ بوڑھوں کی بحث، آوازے، نعرے۔ ہر قسم کی آوازوں کا ہجوم ممتا کے کانوں میں پڑ رہا تھا۔ ممتا نے کافی دیر تک اپنے کانوں میں دونوں انگلیاں ڈال لیں۔ شور اب دُور سے آتا ہوا سنائی دینے لگا۔ ممتا نے تھک کر اپنا سر اپنے گھٹنوں پر رکھ لیا۔ ناؤ دریا کے بہاؤ کے رُخ چلتی رہی۔ دبی ہوئی، سکڑی ہوئی گٹھڑی بنی ہوئی ممتا ناؤ میں بیٹھی رہی۔ نیند نے ہوش و حواس کو اپنی آغوش میں لپیٹ لیا۔

نرم پانی سخت ہونا شروع ہو گیا۔ مٹی بن گیا۔ اینٹیں بن گیا۔
دیواریں بن گیا۔ لکڑی کی ناؤ لکڑی کی کوٹھڑی بن گئی۔ اسکول کے عملہ کے
کوارٹروں کے ایک کمرہ میں ممتا سوئی پڑی تھی۔

کہتے ہیں کرشن لال کے دولتمند دالان میں بارہ برس کے بیٹے نے کھیلنا شروع کیا۔ اس کی ماں نے اس کے جھولنے میں چاندی کی ڈوری ڈلوائی۔ آج جب کرشن لال شام کو گھر آیا تو سرلا بچے کی چاندی کی بنی ہوئی دودھ کی بوتل میں دودھ ڈال رہی تھی۔ کرشن لال آتے ہی ہنس پڑا۔

"سرلا تم نے بوتل تو چاندی کی بنوائی مگر یہ نہ سوچا کہ دودھ کا اندازہ کیسے لگاؤ گی۔ شیشے کی بوتل میں تو دودھ ساتھ ساتھ دکھائی دیتا رہتا ہے کہ دودھ کتنا ختم ہوا اور کتنا باقی ہے۔"

"نہیں جی۔ شیشے کی بوتل میں دُور سے ہی دُودھ سفید سفید نظر آتا رہتا ہے۔ بھرا پڑا گھر ہے۔ لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ دودھ کو نظر لگ جاتی

ہے۔"

"دیو کو آئے ہوئے دو تین روز ہو چکے ہیں۔ اُس کی طبیعت ٹھیک ہو بھی۔ دیوراج کرشن لال سے عمر میں کافی چھوٹا تھا۔ لیکن کرشن لال کا بڑا پیارا دوست تھا۔ کبھی کبھی سرلا ہنستے ہوئے کہا کرتی تھی کہ کتنا اچھا ہوتا اگر ان دونوں دوستوں میں ایک لڑکی بن جاتا اور ایک لڑکا دونوں ہر گھڑی اکٹھے رہ سکتے۔

"کہیں بیٹھا ہُوا شعر کہہ رہا ہوگا۔"

"یا کسی مریض کی چیر پھاڑ کر رہا ہوگا

"بہت اچھا انسان ہے۔"

"کیا مجھ سے بھی اچھا ہے۔؟

"ہم انسان ہیں۔ وہ دیوتا ہے۔"

"بھابی۔ بھابی۔" باہر سے دیو کی آواز آئی

"دیوجی۔ کیا تم آ گئے۔ ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔"

"ہمیشہ بھابی کو ہی آواز دیتے ہو۔ کبھی بھائی کو بھی یاد کر لیا کرو۔"

"گھر میں بھابی کا راج جو ہُوا اور تمہارے دفتر میں تمہارا راج ہے۔ کیا مجال جو میں وہاں بھابی کو آواز دوں۔" دیو دراصل ان دونوں کے درمیان کھڑا ہو گیا۔

کیا تمہیں معلوم ہے آج ہمارے درمیان بحث چھڑ گئی۔

"لو بھئی۔ تمہاری بھابی کہتی ہے کہ مجھ سے دیو بڑھیا ہے۔"

"میں نے یہ تو نہیں کہا تھا۔ کہ تم سے بڑھیا ہے۔ میں نے تو کہا تھا کہ ہم اور تم انسان ہیں اور دیو دیوتا ہے۔"

"کاش بھابی۔ میں دیوتا نہ ہوتا۔ کاش میں تمہاری طرح ہنس سکتا۔ رو

سکتا۔۔۔۔" دیو سامنے دیوار پر لٹکی ہوئی کرشن لال کے بچّے کی تصویر دیکھنے لگا۔

"بھیا دیو۔ یہ بھی تو دیوتا کی مہربانی ہے ورنہ ہم بچارے کون ہیں۔"

"نہیں۔ نہیں۔ بھابی یوں نہ کہو۔ کوئی اور بات کرو۔"

" ہاں۔ سچ۔ کوئی اور بات کرنی چاہیئے۔ سرلا کہہ رہی تھی۔ کہ دیو اس لئے نہیں آیا ہوگا کہ کسی دیوتا کو آسمان سے اُتار رہا ہوگا۔"

"میں تو کسی کو دھرتی پر سے بھی کسی کو اپنے پاس نہیں لا سکتا۔ آسمان سے میں کس کو لا سکتا ہوں۔"

" کتنا فرق ہوتا ہے ایک ڈاکٹر اور شاعر میں۔ ایک تصوّر کی حسین تصویر کا پرستار۔ اور دوسرا دُنیا کی بدصورتی کا تماشائی۔ سچ بتاؤ دیو۔ اتنے زخم دھو دھو کر اور اتنے مریض دیکھ دیکھ کر تصوّر اور تصویر کیا ختم نہیں ہو جاتے؟" کرشن لال نے دیو کا بازو پکڑ کر اُسے اپنے پاس صوفے پر بٹھا لیا۔

"نہیں دوست۔ ایک انسان میں بیک وقت بہت کچھ سانس لے رہا ہوتا ہے۔" دیو یہ کہہ کر ہنس پڑا۔ اور پھر کہنے لگا "اور پھر شاعری صرف حسین تصوّر ہی تو نہیں ہوتی۔ من کی بھوک۔ جو زخم سے بھی زیادہ بھیانک ہوتی ہے شاعری اُس میں بھی جنم لیتی ہے۔" آیا بچے کو لے آئی۔ بچے نے اس گھر میں روز آنے والے مہمان کو پل بھر میں پہچان لیا اور بانہیں پھیلا کر دیو کے پاس آگیا۔ دیو اس کی انگلیوں سے، اس کی ہتھیلیوں سے اور اُس کے پیروں سے کھیلتا رہا۔ بچہ اس کے کوٹ میں لگے ہوئے پِن کی طرف لپکتا رہا۔ اور اُسے اُتارتا رہا لیکن پِن کا کلپ اُس سے اُتر نہ سکا۔ بڑے پیار سے دیو کی ٹھوڑی پکڑ کر بولا "لینا ہے۔" اور پھر اس نے پِن کی طرف دیکھا۔

"اچھا بن لو گے۔ لکھو گے۔؟ میری طرح شعر لکھو گے؟" دیو نے کوٹ سے پِن اُتار دیا۔ بچہ کھیلتا رہا۔

"بچے زندگی سے صرف کھیلتے ہی ہیں۔ اس کے بارے میں شعر نہیں کہتے۔" کرشن لال ہنستے ہوئے بولا۔

"بچے صرف کھیلتے ہی ہیں۔ جوانی ان کھیلوں کو شاعری بنا دیتی ہے۔" دیو بچے اور پِن کی طرف دیکھتا رہا۔

"تم تو شعروں میں باتیں کرنے لگے۔ یہ بھلا کیا بات ہوئی کوئی شعر سنا دو" کرشن لال نے کہا۔

نرملا کو بھی دیو کی شاعری بہت پسند تھی۔ بچہ دیو کی ٹانگوں پر کھیلتا رہا اور دیو شعر سنانے لگا۔ اس کے جذبات کچھ ایسے تھے۔" شام کے بعد صبح اور صبح کے بعد شام ہوتی ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا رہتا ہے۔ جیسے دو آنکھیں مجھے ہر گھڑی دیکھتی رہتی ہیں۔ میں جس راہ پر بھی جاتا ہوں۔ دو آنکھیں میرا پیچھا کرتی ہیں۔ میں جب کسی پھول کی طرف دیکھتا ہوں تو وہ دو آنکھیں اس پھول پر آکر بیٹھ جاتی ہیں۔ پھول نہیں دکھائی دیتا۔ کانٹا نہیں دکھائی دیتا۔ صرف دو آنکھیں نظر آتی ہیں۔ راتوں کے اندھیرے بھی مجھے اُن سے نہیں چھڑا سکتے۔ دو آنکھیں میری زندگی کے سامنے دھرتی بن کر بچھ جاتی ہیں۔ آسمان بن کر چھا جاتی ہیں۔ ہوا بن کر میری رگ رگ میں سما جاتی ہیں۔"

نرملا اور کرشن لال بڑی دیر تک اس کے شعروں میں گُم رہے اور دیو شاعری کی حدود سے بھی آگے کہیں گُم تھا۔

"میں نے کہا کیا تم آ گئے ہو۔؟" ایک دن کمرے میں بیٹھی نرملا نے باہر سے آتی ہوئی کسی کی آواز سُن کر کہا۔

"ہاں بھابی آ تو گیا ہوں۔ لیکن دیو ہوں کرشن نہیں ہوں"۔ دیو کمرے میں آ گیا۔ سرلا ہنس پڑی۔

"پرستار کی نگاہوں کا فرق ہوتا ہے اور پرستش تو وہی ہوتی ہے کسی دیوتا کی نہ سہی کرشن کی سہی"۔ دیو نے پھر کہا۔

"ایک غریب پرستار کی بھلا قیمت ہی کیا ہے۔ کرشن کے پرستار تو ان گنت ہیں۔ تنہا گوپیاں ہی ۳۶۰ تھیں"۔ سرلا ہنستے ہوئے کہنے لگی۔

"بھابی یہ بات نہیں۔ کبھی کبھی کوئی اکیلا پرستار ہی ۳۳ کروڑ دیوتاؤں کی ایک ہی بار پوجا کر لیتا ہے۔ کیوں؟"

بھابی نے پرستار کی طرفداری کی تھی۔ اور دیو نے دیوتاؤں کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔

"کروڑوں دیوتا ہیں اور اربوں پرستار ہیں۔ کیا تم نے میرے دیوتا کے لئے آیا کا انتظام کیا ہے یا نہیں؟" سرلا بھابی نے دیو سے پوچھا۔

"بھابی تیرے دیوتا کے لئے آیا؟ کیا کرشن کے لئے اب آیا رکھو گی۔۔۔ ۔۔۔؟" دیو ہنسنے لگا۔

"منو کے لئے آیا رکھنی ہے۔ وہ بھی تو میرا دیوتا ہے"۔

"ہماری بھابی کے دو دیوتا ہو گئے۔ ایک پتی اور دوسرا بیٹا"۔

"ایک دیو بھی"۔ سرلا ہنس پڑی۔ "صرف پرستش کا فرق ہے۔ پتی کی پرستش کسی اور طرح کرتی ہوں بیٹے کی کسی اور طرح اور دیو ربھیا کی کسی اور طرح"۔

"منو کہاں ہے۔ دیوتا نمبر ۲"

"ابھی رو رو کر سو گیا ہے۔

"ہونہہ"۔ کیا منہ بنا کر سو گیا ہے۔

"کوئی آیا جلدی ڈھونڈھنا۔ پرسوں سے وہ سیر کو بھی نہیں نکلا۔"

"مجھے رکھ لو بھابی۔ تمہارا بیٹا کھلایا کروں گا۔"

"مذاق کرتے ہو نا۔" سرلا نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اس کا نوکر پیغام لے کر آیا کہ وہ ایک آیا ڈھونڈ کر لایا ہے۔ سرلا نے اُسے اندر بُلا لیا۔

"ایک بچہ ہے۔ کیا اُسے اچھی طرح کھلا سکو گی؟" سرلا نے پوچھا۔

"بیگم۔ عمر بیت گئی ہے اس کام میں۔ کیسے نہ کھلاؤں گی۔" کام دیکھ کر خوش ہو جاؤ گی۔" آیا ادھیڑ عمر کی تھی۔ چال ڈھال اور بات چیت سے سمجھدار معلوم ہوتی تھی۔

"پہلے کہاں کام کرتی رہی ہو۔؟" سرلا نے پوچھا۔

"پہلے میں لاہور میں تھی۔ اُس رائے صاحب کے یہاں۔ اچھا سا نام ہے۔ اُن کے بیٹے کا۔ ہاں۔ جگدیش چندر۔ اُن کے یہاں چار مہینے کام کیا پھر میں گاؤں چلی گئی۔ اب بہت دنوں کے بعد آئی ہوں۔"

آیا کی یہ بات سن کر دیو چونک پڑا۔ سرلا آیا سے باتیں کرتی رہی۔

"وہاں اس قدر جلد کام کیوں چھوڑ دیا؟ اور یہاں دلی میں کب سے آئی ہو۔؟"

"میں نے کام تھوڑا ہی چھوڑا تھا۔ وہ لوگ تو بیچارے بہت اچھے تھے۔ جب مَیں نے کام چھوڑا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔" آیا کا دل واقعی بھر آیا۔

"تو پھر چھوڑا کیوں۔؟" اس بار دیو نے تیزی سے پوچھا۔

"بس سمجھ لو کہ تقدیر ہی خراب تھی۔ میں نے تو سوچا کہ بس اب زندگی یہیں کٹ جائے گی۔ مگر مقدر میں ٹھوکریں لکھی ہیں۔ جب سے اُن کے یہاں

بچی پیدا ہوئی۔ اس کی ماں کچھ بیمار رہنے لگی۔ اُسے کوئی خاص بیماری تو نہیں تھی۔ بیٹھے بیٹھے ڈر جاتی۔ کبھی کبھی بیہوش ہوجاتی کبھی کبھی چلانے لگتی۔ "میرا بچہ مت چھینو" وہ ٹھہرے امیر لوگ۔ ڈاکٹر نے کہہ دیا کہ آیا بدل دو۔ بس انہوں نے مجھے جواب دیدیا۔ ایک چپٹی سی ناک والی ایک اور آیا رکھ لی ہے۔ کیوں بابو۔ اس سے کیا روگ کٹ جاتے ہیں؟" آیا دیو کی طرف دیکھتی رہی۔ سوچتی رہی شاید بابو ابھی یہ کہے گا کہ تیری صورت تو بری نہیں۔ جس سے ڈر لگتا ہو۔ مگر دیو نے آیا کی طرف دیکھا ہی نہیں۔ کچھ کہا نہیں وہ خاموش کھڑکی کی طرف منہ کرکے بیٹھا رہا۔

"یہاں دلی میں میری بہن رہتی ہے۔ ماموں کی لڑکی۔ اُن کے یہاں آئی تھی۔ اب لاہور جانے کو جی نہیں چاہتا۔ جہاں کام کروں گی۔ وہیں دو روٹیاں مل جائیں گی۔" آیا نے اپنے آپ کہا۔

"اچھا تنخواہ کیا لوگی۔؟" سرلا آیا سے پوچھتی رہی اور آخر کار فیصلہ کر لیا۔ سرلا نے آیا کو نوکر رکھ لیا۔ اتنے میں کرشن بھی آگیا۔ تینوں بیٹھے رہے۔ دیو کی گہری خاموشی اور افسردگی دونوں کو نظر آتی رہی۔ کرشن نے بہت سی باتیں پوچھیں۔ دیو کچھ بھی نہ بتا سکا۔ جب دیو واپس جا رہا تھا تو نئی آیا منو کو بیرونی باغیچے میں کھلا رہی تھی۔ دیو اُس کے قریب سے خاموش نہ گذر سکا۔ منو کے ساتھ کھیلتا رہا۔ نئی کیاری سے سُرخ رنگ کے پھول توڑ کر منو کی قمیض سے لگاتا رہا۔ اب منو اچھی طرح دوڑ سکتا تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی کیاریوں میں چھپتا رہا اور ڈھونڈتا رہا آیا بھی ہنستی رہی۔

"جہاں تم پہلے کام کرتی تھیں۔ وہاں بچی کا نام کیا تھا۔ دیو نے تھوڑی دیر کے توقف کے بعد آیا سے پوچھا۔

"اسے رجو کہہ کر بلایا کرتے تھے" آپا نے جواب دیا۔

"رجو۔ رجو۔" دیو چونک پڑا۔

"بابو۔ بڑی پیاری بچی تھی۔ ماں کی طرح خوبصورت تھی۔ تو کچھ بڑی ہو گئی ہو گی۔ اس آپا کو شاید سچ مچ وہ بچی پیاری تھی۔ دیو کا ہاتھ کانپ گیا۔ اُس نے منو کو گود میں اُٹھا رکھا تھا۔ وہ بمشکل گرتے گرتے بچا۔

ڈاکٹر روی شنکر کی بیٹی راجکماری بہت حسین تھی۔ عام لڑکیوں سے زیادہ حسین۔ اُس کا مذاق بھی بڑا لطیف تھا۔ اس نے مصوری سیکھی ہوئی تھی ویسے وہ کچھ کچھ علم موسیقی سے بھی واقف تھی۔ اس کا والد دولتمند تھا۔ اس لئے اُس کے قلق کو نکھرنے کا موقع مل گیا تھا۔ کماری ڈاکٹر دیو کو بڑی اچھی نظروں سے دیکھتی تھی۔ اس بات کا کماری کے والد کو علم تھا۔ ڈاکٹر دیو سردار چند گنے چنے لوگوں سے بھی اچھا تھا۔ کماری کے والد کو معلوم ہوا کہ اس کے دل میں ڈاکٹر دیو کے لئے بڑی قدر تھی۔ اس کو اپنی بات پہ ناز تھا۔ کماری کی صرف ایک ہی بڑی بہن تھی۔ اور وہ شادی شدہ تھی۔ گھر میں کماری بڑی تنہائی محسوس کرتی تھی۔ اس لئے کماری اور اُس کے پتا کے لئے ڈاکٹر دیو کی ہمدردی بہت ضروری تھی۔ ڈاکٹر دیو بڑی مشکل سے کبھی اپنے گھر میں روٹی کھا سکتا تھا۔ اور اکثر کماری کی میز پر اُس کا مہمان ہوا کرتا تھا۔ کماری کے پتا ڈاکٹر روی شنکر کے گھٹنوں میں اکثر درد رہا کرتا تھا۔ اس کا اپنا ہسپتال بھی تھا۔ دیو بھی ایک ڈاکٹر تھا۔ ہسپتال میں اور کتنے ہی ڈاکٹر تھے۔ لیکن ڈاکٹر روی شنکر کے گھٹنوں کے جوڑ اس قدر کھوکھلے ہو چکے تھے کہ کماری کا پتا اکثر اپنی کوٹھی کے برآمدے، باغیچے یا کمرہ میں آرام کرسی پہ بیٹھا رہتا تھا۔ اس لئے ڈاکٹر کے خیالات، ڈاکٹر دیو کی صحبت، ڈاکٹر دیو کی شاعری کماری سے بھی زیادہ کماری کے پتا کے لئے ضروری تھی۔ کماری

کانفیس اور عام سطح سے بلند حسن مذاق سہیلیوں کی محفل میں اُکتا جایا کرتا تھا کتابوں کی دن رات کی ہمدمی سے بھی تھک جایا کرتا تھا۔ اس لئے کماری کے پتا سے بھی زیادہ کماری کو ڈاکٹر دیو کو ضرورت تھی۔

کماری نے آج چائے کی میز رکھوادی تھی۔ کماری اور اس کے پتا میز کے گرد بیٹھے تھے۔ پیالیوں سے گرم چائے کا دھواں اُٹھ رہا تھا۔ میٹھے انڈوں کے ٹوسٹ کماری کے پتا کو بہت مرغوب تھے۔ یہ ٹوسٹ بھی میز پر پڑے تھے۔ لیکن دونوں کو یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ کیا کچھ نہیں تھا۔ اس "کچھ" کے بارے میں دونوں کو کوئی غلط فہمی نہیں تھی۔ دونوں جانتے تھے کہ وہ "کچھ" ڈاکٹر دیو کے سوا اور کچھ نہیں تھا

میٹھی اور گرم چائے کا پھیکا پن اور ٹھنڈا پن زیادہ دیر تک قائم نہ رہا۔ ڈاکٹر دیو آگیا۔ کماری ہنس پڑی۔ کماری کا پتا ہنس پڑا۔ کمرہ سج گیا میز پُر رونق ہو گئی۔ تینوں ہنستے رہے۔ اور چائے پیتے رہے۔ اس کے بعد دیو آج کے ایک خطرناک کیس کی باتیں سناتا رہا۔ کیسے اس نے ایک نوجوان کا آپریشن کیا تھا۔ اُسے پلوری تھی۔ اِس کی نئی بیاہی بیوی رو رہی تھی۔ جیسے اس کی زندگی کا آپریشن ہو رہا ہو۔ ڈاکٹر دیو کہہ رہا تھا۔ غریب اور معمولی حیثیت کے گھروں میں بچاری عورت کی زندگی پتی کے ہنسنے سے ہنستی ہے۔ اور پتی کے رونے پر روتی ہے۔ پتی کے بیمار پڑنے سے بیمار ہو جاتی ہے اور پتی کی موت پر مر جاتی ہے۔

"تمہارا کیا خیال ہے کہ عام سطح سے اونچے گھرانوں میں عورت کا پیار پیار نہیں ہوتا؟ عورت کا دل تو سدا عورت کا دل رہتا ہے۔ وہ ہمیشہ محبوب کی زندگی کے ساتھ جیتی ہے اور محبوب کی موت کے ساتھ مرتی ہے۔" کماری

بحث کرنے لگی - وہ ڈاکٹر دیو کی بات پر ذرا ناراض ہو گئی تھی۔

"یہ درست ہے۔ مگر میں تو کہہ رہا تھا کہ امیر عورت کے لئے گھر کے سوا زندگی کے دیگر پہلو بھی بڑی حد تک بہلاوے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ لیکن ایک غریب اور سیدھی سادی عورت کے لئے پتی کے سوا اور کوئی دل بہلاوا نہیں ہوتا۔" ڈاکٹر دیو نے کہا۔

"گھن کھائے ہوئے دانہ کی طرح اگر وہ عورت ہنستی بھی رہے، سوسائٹی میں گھومتی پھرتی بھی رہے تو اس کے درد کی قدر و قیمت کم تو نہیں ہو جاتی۔" کماری ابھی تک بحث کر رہی تھی۔

پھر بھی سوچتے رہے۔ پلورسی کا روگ دب جانے پر بھی اُبھر جاتا ہے۔ ایسے کتنے ہی خطرناک روگ ہیں۔ زندگی بیماریوں سے، افلاس سے اور لاکھوں دشواریوں سے بندھی ہوئی رینگتی رہتی ہے۔

کماری کا پتا شام کی چائے کے بعد تھوڑی دیر کے لئے مطالعہ کیا کرتا تھا اور پھر باغ میں ٹہلا کرتا تھا۔ اب کتاب پڑھنے کا وقت ہو گیا تھا۔ کماری اور ڈاکٹر دیو دونوں کماری کے کمرے میں چلے گئے۔ کماری کوئی گیت سنائے گی یا ڈاکٹر کوئی نظم سنائے گا۔ دونوں اُس کے لئے ایک دوسرے سے اصرار کیا کرتے تھے۔ آخر سمجھوتہ یوں ہوتا تھا کہ ڈاکٹر دیو اپنی نظم سنائے اور پھر کماری اسی نظم کو گا کر سنائے۔ دیو نے اپنا نیا گیت سنایا۔ وہ گیت کچھ ایسا تھا۔ چاند اور تاروں بھری رات ہے۔ ہم سے ضرور ملنا۔ سرسوں میں نئے شگوفے نکل آئے ہیں۔ ہمیں ضرور ملنا۔ موسم بدل گیا ہے۔ لیکن میرے غم ویسے ہی ہیں۔ میری آغوش ویسی ہی ویران ہے۔ ہم سے ضرور ملنا۔ ایک زمانہ تھا کہ میں تیرا تھا۔ اک زمانہ تھا کہ تو میری تھی۔ لیکن وہ دن کہاں گئے؟ آج چاند

اور تاروں بھری رات ہے۔ ہم سے ضرور مل جانا۔"

ڈاکٹر دیو نے جب اپنا یہ گیت ختم کیا تو کماری نے اس گیت کو گا کر سنانا شروع کر دیا۔ کماری تان پورے کے تار دھیرے دھیرے چھیڑ رہی تھی۔ اس کے گلے سے تلنگ کے سُر بیدار ہو رہے تھے۔

کماری گاتی رہی۔ ڈاکٹر دیو کچھ گھبرا گیا۔ اُسے یوں محسوس ہُوا جیسے یہ گیت تو وہ کسی اور کے لئے لکھ رہا ہو۔ مگر کماری یہ گیت اُس کے لئے گا رہی ہو۔

کماری خوبصورت تھی۔ کماری بہت پیاری تھی۔ کماری اس سے محبت کرتی تھی۔ لیکن دیو سوچ رہا تھا کہ اس کے ہاتھوں میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ کماری کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام سکے۔ اس کے قدموں میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ کماری کے ساتھ ساتھ چل سکے۔ اُسے کوئی حق نہیں تھا کہ وہ کماری کو اُس راستہ پر ڈال سکے جس راہ پر وہ خود نہیں چل سکتا تھا۔ مگر وہ کماری کو اس بات سے مطلع کیونکر کرے۔

ڈاکٹر دیو نے سوچا دکھ تو ہر جگہ بکھرے ہوئے ہیں۔ اس شہر جیسی بیماریاں دوسرے شہروں میں بھی ہیں۔ وہ کہیں اور جا کر ڈاکٹری کی پریکٹس شروع کر دے۔ مگر کماری کا پتا جس کے احسان اور نوازش کے بوجھ تلے وہ دبا ہُوا تھا کیا سوچے گا؟ پھر کرشن لال بھی تو ہے جس کے سوا اس کا اور کوئی دوست نہیں تھا اور سرلا بھی تو تھی جو ماں جیسی بھابی تھی۔ بہن جیسی ہمدم تھی۔ ادرہ۔ ادر منو بھی تو تھا۔ اس کے کھلنڈرے پن کو وہ کیسے فراموش کر سکے گا۔ ڈاکٹر دیو کو یوں محسوس ہُوا جیسے اس کے پاؤں زمین میں دھنس گئے تھے۔

دوسرے دن راجکماری نے خاص طور پر ڈاکٹر دیو کو چائے پر بلوایا

ہُوا تھا۔ دیو نے جا کر دیکھا کہ راجکماری کی دو تین سہیلیاں اور کماری کے پتا کے ایک دو بزرگ دوست کمرے کی رونق بڑھا رہے تھے۔ کماری کے پتا نے بڑے پیار کے ساتھ دیو کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ اُن سب نے ڈاکٹر دیو کو گاہے بگاہے دیکھ رکھا تھا۔

آج کی چائے روز کی نسبت زیادہ پُر تکلف تھی۔ ڈاکٹر دیو کی ڈاکٹری اور اس کی شاعری کی تعریف ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر دیو چھریرے بدن کا انسان تھا۔ قد لمبا تھا۔ رنگ زیادہ گورا چٹا نہیں تھا۔ مگر بہت دلکش تھا، دیو کے چہرے پر تبسم زیادہ نہیں ہُوا کرتا تھا۔ ایک سنجیدگی سی چھائی رہتی تھی۔ کبھی کبھی باتیں کرتے ہوئے جنون کی ایک جھلک بھی اس کے چہرے پر پیدا ہو جاتی تھی۔ کماری کی سبھی سہیلیوں کو وہ بہت اچھا لگتا تھا۔ لیکن اس کی سنجیدگی کے سامنے وہ کھل کر ہنس نہیں سکتی تھیں۔ آج سب نے ہنستے ہنستے ڈاکٹر دیو کو مبارک باد دی۔ ڈاکٹر دیو، کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ لیکن گرم سوٹ کے تحفے اور جنم دن کے موقع پر مبارک باد کے کارڈ نے ڈاکٹر دیو کو یہ بتایا کہ آج اس کا جنم دن منایا جا رہا تھا۔ یہ تحفہ ڈاکٹر دوی شنکر نے دیا تھا۔ جو کہہ رہے تھے کہ ڈاکٹر دیو اُنہیں بیٹے کی طرح عزیز ہے۔

چائے ختم ہوئی۔ مہمان چلے گئے۔ کماری دیو کو اپنے کمرے میں لے گئی۔

"مجھے آج ذرا جلدی ہے۔"

"اگر تم مجھ سے پوچھتے ہو تو تم نہیں جا سکتے۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہُوا کہ اگر مانگی ہوئی اجازت نہ ملے تو بن مانگے ہی رخصت ہونے کی گستاخی کی جا سکتی ہے۔"

"زبردستی کے آگے شکست تسلیم کرنے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔"

"نہ جانے دُنیا بھی تو زبردست ہے۔"

"تو پھر تم شکست تسلیم کر لو۔"

"اگر میرے اکیلے کی شکست کا سوال ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ میں بہت کچھ ہار کر بھی کماری کو خوش کر دیتا مگر۔۔۔۔"

"تم ہارتے جاؤ گے تو کماری سدا خوش رہے گی۔"

"اب کیا حکم ہے؟"

"اِدھر آؤ۔" کماری نے الماری کھولی۔ "جنم دن پر کیا میرا تحفہ قبول نہیں کرو گے۔؟" دیو نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ کماری نے دیو کی تصویر تیار کی تھی۔ دیو کو معلوم تھا کہ کماری کو کچھ مصوری بھی آتی ہے۔ مگر اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ اتنی اچھی مصوری جانتی ہے۔ دیو نے سوچا کماری نے اس کے خدوخال اچھی طرح دیکھے ہوں گے۔ خیالوں میں اُس کی تصویر بنائی ہوگی۔ اور پھر گھنٹوں کی ریاضت کے بعد اُنہیں کاغذ پر اُتارا ہوگا۔ ان سب باتوں سے زیادہ دیو یہ دیکھ کر گھبرا گیا کہ اُس تصویر پر پھولوں کا ایک ہار پڑا ہوا تھا۔

"اس فن کی داد کیسے دوں؟ کماری۔۔۔۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو۔؟"

"میں اس احسان کا بدلہ کیسے دوں گا؟ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔؟"

"یہ کوئی احسان نہیں۔ اور تحفہ کبھی فروخت نہیں کیا جاتا۔"

"مگر اس کے گلے میں پھول کیوں ہیں۔؟"

"کیا آج تمہارا جنم دن نہیں۔ میں نے سوچا تھا یہ ہار تمہارے گلے میں ڈالوں گی۔ مگر ہمت نہ ہوئی۔" کماری نے سر جھکائے رکھا۔ دیو کا جی چاہا کہ وہ کہہ دے "کماری یہ ہمت کبھی نہ کرنا۔" لیکن وہ یہ بات کہہ نہ سکا۔

"کماری۔ میری صحت کچھ خراب رہتی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ مجھے یہاں کی آب و ہوا بدلنی چاہیے۔ پتا جی کی اجازت لے کر کسی اور شہر میں کام کرونگا"

ڈاکٹر دیو ڈاکٹر روی شنکر کو پتا جی کہہ کر بلایا کرتا تھا۔

کماری نے میز کا سہارا لیتے ہوئے ڈاکٹر دیو کی طرف دیکھا۔ دیو سے اتنا پیارا شکوہ برداشت نہ ہوا۔ اُس نے نگاہیں جھکا لیں۔ کماری جانتی تھی۔ کہ دیو کی مرضی کو ٹالنا آسان بات نہیں ہوا کرتی تھی۔

"تمہاری طبیعت کچھ خراب رہتی ہے۔؟"

"ہاں۔ کچھ......"

"کون سے شہر جانا چاہتے ہو۔؟"

"ٹھیک سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ابھی میں نے کچھ سوچا بھی نہیں"

"پھر یہاں کب آؤ گے۔؟"

"کماری۔ جب تم مجھے اپنے بیاہ پر بلواؤ گی تو آؤں گا"

کچھ دن گذر گئے۔ دیو تو جتنا بیمار تھا۔ وہ تھا ہی لیکن کماری کی صحت ضرور خراب ہوتی چلی گئی۔ وہ اپنے پتا کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اور وہ بھی ایک امیر باپ کی۔ امیری میں زندگیاں بہت قیمتی ہو جاتی ہیں۔ کماری کے پتا نے تازہ اور پہاڑی آب و ہوا میں اُسے لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ دیو کو بلوا بھیجا۔

"دیو کماری کی صحت خراب رہتی ہے۔ کیا تم نے کبھی اس طرف دھیان دیا ہے۔؟"

"ہاں۔ مجھے محسوس تو ہوا تھا"

"میں چاہتا ہوں کہ کماری کو چند روز کے لئے کسی پہاڑ پر لے جاؤں"

"ضرور لے جائیے"

"تمہیں معلوم ہے میرے گھٹنے..... تمہارا ہمارے ساتھ جانا ضروری ہے۔ میں اکیلا اس کی دیکھ بھال نہیں کر سکتا۔"

"پتا جی۔ پیچھے اتنے کام بکھرے ہوئے ہیں۔"

"کماری کی زندگی سب کاموں سے زیادہ ضروری ہے۔" کماری کے پتا نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

پہاڑ پر جانے کی تیاری ہونے لگی۔ کماری کے دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہاں دیو کسی الگ گھر میں نہیں رہے گا۔ کسی ہسپتال کے فرائض اُسے آواز نہیں دیں گے۔ بیماری کتنی اچھی چیز ہے۔ دیو کماری کے نزدیک نہیں آسکتا تھا لیکن ڈاکٹر تو بیمار کے نزدیک آئے گا۔

دیو، کماری اور اس کا پتا تینوں نوکروں سمیت پہاڑی سامان کے ساتھ مسوری چلے گئے۔

مسوری کی کوٹھی بہت بڑی تھی۔ تینوں کے کمرے اس قدر طویل تھے۔ کہ وہ کمرے منہ اُٹھا اُٹھا کر ان کا انتظار کرتے رہتے۔ مگر کوئی بھی اُن میں بیٹھتا نہیں تھا۔ ڈاکٹر روی شنکر برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھا رہتا تھا۔ کماری اور ڈاکٹر دیو کافی دیر تک پہاڑوں کے نشیب و فراز میں گھومتے رہتے تھے۔ اگر وہ کبھی بیٹھتے بھی تھے تو تینوں ایک ہی کمرے میں بیٹھتے تھے۔

ایک دن ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ ہلکی ہلکی پھوار۔ پڑوس کی کوٹھی سے کماری کی نئی سہیلی اور اُس کا بھائی ان کے گھر آئے۔ ایک دو دوست سب کے سب کماری کے یہاں آئے۔ سب سیر کرنا چاہتے تھے۔ کماری بارش کی وجہ سے ذرا جھجکتی رہی مگر سیر کو نکل کھڑے ہوئے۔ کماری ویسے بھی ذرا کمزور تھی۔ دیو نے زبردستی ایک چھتری اُس کے ہاتھ میں تھما دی۔ باقی اشخاص نے

اپنے ساتھ کچھ بھی نہ لیا۔ سب ہنستے اور کھیلتے نکل کھڑے ہوئے۔ بارش بالکل بند ہو چکی تھی۔

"تجھ پر خواہ مخواہ یہ بوجھ لاد دیا ہے۔" کماری نے ہنستے ہنستے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھتری کی طرف دیکھ کر کہا۔ دیو نے آہستگی کے ساتھ کماری کے ہاتھ سے چھتری لے لی۔

"اچھا چھتری کو بانٹ لیتے ہیں۔ جب تک بارش بند رہے گی۔ یہ چھتری میری ہوگی اور جب تک مینہ پڑتا رہے گا۔ چھتری تمہاری ہوگی۔" دیو نے ہنستے ہوئے کہا۔

اس پر سب ہنس پڑے۔ تھوڑی دیر کے بعد واقعی بارش ہونے لگی۔ دیو نے چھتری کھول کر کماری کی طرف بڑھا دی۔

"اونہہ۔ میں یہ بوجھ نہیں اُٹھا سکتی۔ تم ہی یہ بوجھ اُٹھاؤ۔ اگر کہو تو میں تمہاری چھتری تلے آ سکتی ہوں۔" کماری ہنستے ہنستے دیو کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ دیو نے چھتری کو اپنے سر سے ہٹا کر کماری کے اُوپر پھیلا ئے رکھا۔ بارش کے ہلکے ہلکے چھینٹے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ مینہ بند ہو گیا۔ دیو نے چھتری بند کر کے پکڑ لی۔ سب لوگ کھل کر ہنستے رہے۔ دیو نے چھتری پکڑے رکھی۔

"مجھے ڈر لگتا ہے کہ یہ بوجھ تمہیں ہمیشہ ہی نہ اُٹھانا پڑے۔" کماری نے ایک بار دیو کے نزدیک جا کر کہا۔

دیو کو معلوم تھا کہ ایک ذرا سی اس بات کا بہت بڑا مطلب تھا۔ مگر وہ کماری سے کچھ کہہ نہ سکا۔ کماری کے دل میں ایک اشتیاق پیدا ہوا کہ دیو اُس سے یہ کہے کہ وہ چھوٹا سا اور نرم و نازک بوجھ ہمیشہ اُٹھائے رکھے گا۔

اور کبھی تھکے گا نہیں کماری سوچتی رہی - وہ دیو کے کندھوں کا بوجھ نہیں بنے گی۔ ہلکا پھلکا پر بن جائے گی۔ کیا کبھی کسی نے پروں کا بوجھ بھی محسوس کیا ہے؟" اُلٹا دیوان پروں کے سہارے اُڑ سکے گا۔ کماری دیو کا منہ تکتی رہی۔ دیو کے چہرہ پر کسی بھی جذبہ کے آثار موجود نہیں تھے - وہ چہرہ نہ کرخت تھا اور نہ ہی نرم - وہ کچھ نہ بولا۔

اگلے موڑ سے پگڈنڈی کیاریوں کی طرف مُڑتی تھی - وہاں دو تین پہاڑی گھر تھے۔ آج شاید وہاں کوئی شادی ہو رہی تھی۔ کتنی ہی پہاڑنیں چاندی کی جھانجروں کے باعث چھنک رہی تھیں۔ آج انہوں نے نئے اور کورے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ گاڑھے رنگ ہولی کھیل رہے تھے۔ ان کی جھنکار پہاڑوں اور پتھروں سے ٹکرا کر اور بھی بلند ہو گئی تھی۔ سبھی لڑکے سڑک پر کھڑے رہے۔ کماری اور اس کی سہیلی دونوں لڑکیاں پگڈنڈی سے نیچے اُتر کر شادی والا گھر دیکھنے چلی گئیں۔ نیچے الہڑ پہاڑنوں کے گانے کی آواز آ رہی تھی۔

جب کماری اور اُس کی سہیلی دوبارہ اُوپر آئیں تو کماری کا چہرہ اُترا ہُوا تھا۔

"بیاہ والے گھر سے کیا کوئی اس طرح آتا ہے"۔ دیو نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"بیاہ - بیاہ کہاں ہے؟" کماری نے حیران ہو کر کہا۔

"کیا نیچے شادی نہیں -؟ تو کیا ہو رہا ہے۔"

"نہیں تو، ایک میلہ ہے، آج قربانی دے رہے ہیں۔ لوگ جمع ہیں۔" کماری نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"یہ پہاڑی لوگ کئی طرح کے میلے مناتے ہیں۔ کئی قسم کی یہ قربانیاں دیتے رہتے ہیں۔ یعنی آج بارش ہو اور آج بارش نہ ہو۔" کوئی بولا۔ سیب

ہنس پڑے مگر کماری نہ ہنسی۔

"نہیں۔ آج ایک انسان کی قربانی دی جا رہی ہے۔ ایک جوان اور الہڑ لڑکی کی۔" کماری نے جواب دیا۔ ایک بوڑھا زیورات کا ڈھیر لے کر آیا ہے۔ اس کی نسل نہیں بڑھتی تھی۔ جادو ٹونے والوں نے اُسے بتایا کہ وہ ایک جوان لڑکی کی قربانی دے شاید اس کے یہاں اولاد ہو جائے۔" کماری کا جی چاہتا تھا کہ وہ رو پڑے۔

سب سمجھ گئے کہ کسی جوان لڑکی کی شادی ایک بوڑھے سے ہو رہی تھی۔ کماری سے یہ بے انصافی برداشت نہیں ہو رہی تھی سب کو افسوس ہُوا۔ کماری کی سہیلی نے بتایا کہ وہ اس لڑکی کو دیکھ کر آ رہی ہے۔ جس کی شادی ہو رہی تھی۔ بڑی خوبصورت اور جوان ہے۔ سب لوگ سڑک سے ذرا اُوپر پہاڑ کی چھوٹی پگڈنڈیوں اور پتھروں پر بیٹھ گئے۔

ایک عورت نے بتایا کہ اس بوڑھے کی تین بیویاں اور ہیں۔" کماری نے کہا۔

"لڑکی کو شاید یہ بات معلوم نہیں تھی۔ اسی لئے وہ اتنی اداس نظر نہیں آتی تھی۔" کماری کی سہیلی بولی۔

"اگر معلوم بھی ہو تو وہ کیا کر سکتی ہے۔ دیپو نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کی مسکراہٹ بھی دکھ بھری تھی۔

"میں حیران ہوں وہ کیسے وہاں جا کر رہے گی۔ کھائے گی۔ ہنسے گی۔ کھیلے گی۔ وہ ساری عمر وہاں کیسے رہے گی۔" کماری کہتی رہی۔

"کچھ بھی نہیں کماری۔ گھر گھر یہی کچھ ہوتا ہے۔ اتنا نہ سہی کچھ کم سہی۔" دیپو بولا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا۔ جس گھر میں وہ پیار نہیں کر سکے گی۔ وہ وہاں کیونکر رہ سکے گی" کماری نے کہا۔

"کماری ہر روز اتنے بیاہ ہوتے ہیں۔ اتنے لڑکے گھوڑی پر چڑھتے ہیں۔ اتنی لڑکیاں ڈولی میں بیٹھتی ہیں۔ کیا وہ سب زندگی سے پیار کرتے ہیں؟ دیو نے ذرا رک کر پوچھا۔

"اگر نہیں کرتے تو وہ اکٹھے کیونکر رہتے ہیں۔ زندگی کیسے بسر ہوتی ہے۔؟" کماری کے نچلے ہونٹ پر بل پڑ گیا۔ اس کی بات میں پتھر کی ضرب جیسی صداقت تھی۔

"عام زندگیاں یوں ہی راستے پر چلتی رہتی ہیں۔ کوئی شکوہ اور شکایت نہیں کرتیں۔ لوگ مطمئن نظر آتے ہیں" ساتھیوں میں سے ایک شخص بولا۔

"ہاں۔ کیونکہ یہ اُن کی عادت ہو چکی ہوتی ہے اور عادتیں دھیرے دھیرے زندگی بن جاتی ہیں۔ شوہر ہوتے ہیں۔ بیویاں ہوتی ہیں۔ وہ سدا اکٹھے رہتے ہیں۔ بچوں کو جنم دیتے ہیں۔ اُن کی پرورش کرتے ہیں کسی غیر کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ مگر کون کہتا ہے کہ وہ پیار کرتے ہیں" دیو کہتا رہا اور اس کے ساتھی اس کا منہ تکتے رہے۔ "آپ اسے وفاداری بھی کہیں گے۔ لیکن اگر اسی وفادار بیوی کو پہلے دن کسی اور شوہر کے ساتھ بیاہ دیا جاتا تو وہ اس کی وفادار بن جاتی۔ اس کے بچوں کو جنم دیتی انہیں پالتی اور کسی غیر کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھتی۔ یہ وفا ضرور ہے لیکن پیار نہیں۔ عادت ہے۔ ہمارا ہنسنا عادت ہے۔ ہمارا رونا عادت ہے۔ ہمارا جینا عادت ہے"۔ دیو نے یہ بات کہتے کہتے سر جھکا لیا۔ اس کا چہرہ ذرا سُرخ ہو گیا۔ کماری بڑی عقیدت کے ساتھ اس کے منہ کی طرف دیکھتی رہی۔ باقی لوگ بھی دیکھتے رہے۔

اُن کے چہروں پر اس بدصورت سچائی کو سن کر حیرانگی پیدا ہو گئی تھی۔ شاید وہ اسے پہلے بھی جانتے تھے۔ لیکن آج ڈاکٹر دیو نے جس انداز سے اس سچائی کو بیان کیا تھا۔ اس پر اُنہیں حیرانی ہو رہی تھی۔ جیسے کوئی نئی بات سُن رہے ہوں۔

کماری کی صحت اب پہلے سے بہت بہتر تھی۔ ایک دن صبح ہوتے ہی راجکماری بستر سے اُٹھ کر شب خوابی کے لباس ہی میں کوٹھی سے باہر آ گئی پہاڑی صبح بہت حسین تھی مگر راجکماری کا سپنوں سے رنگا ہُوا چہرہ پہاڑی صبح سے بھی زیادہ حسین معلوم ہو رہا تھا۔ کوٹھی کے آگے چیڑ کے اُونچے درخت تھے۔ اسٹرابری کی چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں تھیں۔ راجکماری پیڑ کی ایک لٹکتی ہوئی ٹہنی سے اپنے بازو کو جھولا جھلانے لگی۔ اس کے سارے بدن میں حرکت پیدا ہو گئی۔ راجکماری گانے لگی۔

"میری آرزو انگڑائیاں لے رہی ہے
جاگ جوانی جاگ اجاگنے کا موسم آ گیا"

کماری گا رہی تھی۔ پُرسکون ماحول میں سنگیت جذب ہوتا جا رہا تھا۔ کوٹھی کے اندر سوئے ہوئے کماری کے پتا نے انگڑائی لی۔ کماری کی مسرت کے باعث پتا کی آرزوئیں بھی بیدار ہو گئیں۔ وہ خوش تھا کیونکہ اُس کی بیٹی خوش تھی۔

دیو کی آنکھ بھی کھل گئی۔ دیو وہ گیت سنتا رہا۔ اس کے اندر کوئی بول اٹھا۔ "راجکماری کی آنکھوں پر یہ رنگین عینک اور کتنے دن رہے گی؟ سہانے سپنے ختم ہو جائیں گے۔ ویرانی چھا جائے گی۔ اُسے اصلیت کی دُنیا دکھاؤ۔ حقیقی دنیا۔" دیو اُٹھا۔ باہر آ گیا۔ اُس نے دُور سے کماری کو پیڑ کی ٹہنی سے جھولتے ہوئے دیکھا۔ اُس کے قدم رُک گئے۔ کیا وہ اتنی حسین لڑکی کا

سپنا ایک پل میں توڑ دے گا؟

اس کی صحت اچھی ہو رہی تھی۔ اس کی آرزو بیدار ہو رہی تھی۔ وہ اسے کیونکہ مایوس کر سکتا ہے۔ اُس کی صحت دوبارہ کیونکہ خراب کر سکتا ہے وہ اپنے پتا کے تاریک گھر کی اکیلی کرن تھی۔ وہ اس کرن کو کس ہاتھ سے بجھا سکتا ہے۔

کماری جھولتی رہی۔ اُس نے جھولتے جھولتے مڑ کر دیکھا۔ سامنے دیو کھڑا تھا۔ دیو اب پیچھے نہیں لوٹ سکتا تھا۔ وہ کماری کے نزدیک آگیا۔ وہ ہنسی تو دیو صرف مسکرا دیا۔

"دیو۔"

"جی۔"

"کیا تم میری طرح خوش نہیں۔؟"

"میں اتنا خوش کیونکر ہو سکتا ہوں۔ تم تو راجکماری ہو۔"

"اچھا۔؟"

"میرا مطلب ہے کہ تم سچ مچ ایک راجکماری ہو۔"

"اچھا۔؟"

"اور میں ایک فقیر ہوں۔؟"

"خوب۔"

"میں مذاق نہیں کر رہا۔"

"اچھا تو فقیر بن کر آئے ہو۔ راجکماری تمہیں کیا دے؟"

"میں کچھ لینے نہیں آیا ہوں۔"

"کیا کچھ دینے آئے ہو۔ اچھا تو دو۔"

"نہیں کچھ دینے بھی نہیں آیا ہوں۔"

"پھر۔؟"

"صرف یہ بتانے آیا ہوں کہ راجکماری کا راستہ اور ہوتا ہے اور درویش کا اور۔ جب راجکماریاں ہنستی ہیں۔ تو یہ ضروری نہیں ہوتا کہ درویش بھی ہنس پڑیں۔"

"بہت اچھی بات ہے۔ درویش نہ ہنسیں۔ وہ راجکماریوں کے راستہ پر بھی نہ چلیں۔ مگر یہ تو ہو سکتا ہے کہ جب درویش نہ ہنسیں تو راجکماریاں بھی نہ ہنسیں چونکہ وہ تو درویش کے راستہ پر چل سکتی ہیں۔؟"

"نہیں کماری۔ راجکماریوں کو شاہراہیں زیب دیتی ہیں۔"

"دیو۔ زندگی کے پیڑ پر کبھی کبھی شگوفے کیوں پھوٹتے ہیں۔؟"

"اس لئے کہ کچھ شگوفے پھول بن جانا چاہتے ہیں اور کچھ جھڑ کر گر پڑنا چاہتے ہیں۔"

"اچھا۔ ذرا میرا ہاتھ دیکھو۔ قسمت میں کیا لکھا ہے؟"

"میں چاہتا ہوں۔ صدقدلی سے چاہتا ہوں کہ اس پیڑ پر بھرپور بہار آئے۔"

"نہیں۔ تم یہ نہیں چاہتے۔"

"نہیں کماری۔ یوں نہ کہو۔"

"درویش کا راستہ الگ ہو تو راجکماریوں پر کبھی بہار نہیں آسکتی۔"

کماری نے سر جھکا لیا۔ دیو وہیں کھڑا رہا۔ راجکماری دبے پاؤں کوٹھی کے اندر چلی گئی۔

راجکماری کے پتا کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی کہ راجکماری کے لئے کیا چاہیے۔ اس کی صحت کو اور اس کی مُسرت کو وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ ایک دن راجکماری اپنی سہیلیوں کے چائے پی رہی تھی۔ ڈاکٹر روی شنکر نے دیو کو اپنے پاس بُلایا۔

"دیو بٹیا۔"

"جی۔"

"میرے پاس بیٹھ کر کچھ سناؤ۔"

"اچھا سنو۔ آج ہم کیمل بنک سیر کے لئے گئے تھے۔ ہم نے وہاں کچھ انار توڑے۔ ان میں کوئی کوئی دانہ تھا۔ لیکن بہت ہی میٹھا۔ ایک پہاڑیئے سے

ہم نے پکتے ہوئے ٹماٹر لئے۔ پھر اس کے کھیتوں میں خود مٹر توڑنے کی اجازت مانگی۔"

"ان باتوں میں بھی تمہاری شاعری کا رنگ ہے دیو۔"

"ان میں۔؟"

"ہاں۔ ان میں بھی۔ جیتی جاگتی، ہنسی کھیلتی شاعری۔ شاعری صرف تیرے دُکھ بھرے گیت تو نہیں۔ جی چاہتا ہے تم مجھے روز ایسے شعر سنایا کرو۔ میری زندگی کے باقی دن ایسے شعر سنتے بیت جائیں۔

"پتاجی۔"

"تیرا مجھے پتاجی۔" کہہ کہہ بلانا بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔ میں بہت خوش نصیب ہوں۔ جس کے پاس کماری اور دیو جیسے دو بچے ہیں۔ دیو۔"

"جی۔"

"کماری تمہیں دیکھے بغیر جی نہیں سکتی۔"

"پتاجی۔" دیو گھبرا گیا۔

"ہاں۔ دیو۔ میں اُسے کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں بھی تیرے بغیر نہیں رہ سکتا۔" روی شنکر بڑے پیار سے ہنس پڑا۔ دیو نے سر جھکائے رکھا۔

"دیو یہ شادی کب تک ہوتی چاہیئے۔؟" روی شنکر نے پوچھا۔ دیو اس بات سے ڈر رہا تھا۔

"پتاجی۔ شادی۔؟ میں۔۔۔۔؟

"کماری ہر لحاظ سے تیرے قابل ہے؟" پتا نے فخر سے کہا۔

"لیکن میں کماری جی کے قابل نہیں ہوں۔"

"یہ ہم خود سوچ لیں گے۔" روی ہنس پڑا اور پھر گم بیر ہو گیا۔" دیو

تم سمجھتے ہو کہ کماری کی زندگی مجھے کس قدر عزیز ہے۔"

"کماری جی کی زندگی سب کے لئے عزیز ہے۔"

"یہ بات ہے تو میں اپنی جھولی تمہارے سامنے پھیلاتا ہوں۔ انکار نہ کرنا دیو۔" رودی نے انتہائی انکسار سے کام لیا۔ دیو سر سے پاؤں تک کانپ اُٹھا۔ ایک بزرگ کی جھولی اُس کے سامنے تھی۔

"جیسے کہو پتاجی۔" دیو فوراً کہہ اُٹھا۔ جو کچھ اس کے پاس تھا۔ اُس نے اُسے جھولی میں ڈال دیا۔ رودی پُرسکون اور مطمئن ہو گیا۔ دیو سر جھکا کر چلا گیا۔

کماری آئی تو پتا نے وفورِ مسرت سے اُسے پاس بٹھا لیا۔

"کماری تیری ماں زندہ نہیں ہے۔ سارے کام مجھے ہی کرنا پڑتے ہیں بھگوان نے یہ کرپا بھی کر دی ہے کہ گھر بیٹھے بٹھائے ایک ہیرے جیسا لڑکا بھی مل گیا ہے۔ دراصل تو بہت خوش نصیب ہے۔"

"پتاجی۔"

"ہاں کماری۔ میں شادی کی تاریخ جلد ہی مقرر کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے دیو سے کہہ دیا ہے۔" پتا نے بڑی آرزو سے کماری کے چہرے کی طرف دیکھا کہ ابھی اس کے چہرے پر مسرت کی روشنی پیدا ہو گی۔ جھجکتی ہوئی اور شرماتی ہوئی وہ ہنس پڑے گی۔ لیکن ایسی کوئی بات نہ ہوئی۔

"دیو نے کیا کہا۔؟"

"کچھ بھی نہیں۔ کہتا ہے جیسے کہو۔"

"پتاجی تم نے بہت بُرا کیا۔" کماری نے یہ کہہ کر سر جُھکا لیا۔ پتا کے چہرے پر حیرانی کے آثار چھا گئے۔

" پتاجی۔ تم اُنہیں سمجھتے نہیں ہو۔" یہ کہہ کر کماری چلی گئی۔

دیو کو اس وقت اگر کوئی دیکھتا تو وہ اپنے کمرے میں پلنگ پر سیدھا لیٹا ہُوا تھا۔ اگر کوئی اس کے تکیہ کو ہاتھ لگاتا تو اس کا ایک گوشہ بھیگا ہُوا نظر آتا۔ اگر اس وقت وہاں کوئی نزدیک ہوتا۔ تو وہ اُسے یہ کہتا ہُوا سُنتا۔ " دنیا نے تجھے مجھ سے چھین لیا۔ میں نے تیری یاد کو سنبھال کر رکھا ہُوا ہے۔ دُنیا کو یہ بھی پسند نہیں۔ وہ تیری یاد کو بھی مجھ سے چھین لینا چاہتی ہے۔"

" نہیں دیوجی۔ کوئی بھی کسی سے کچھ نہیں چھینتا۔" کماری نے دیو کے پاس کھڑے ہو کر کہا۔

" اوہ کماری جی تم۔" دیو نے کہا۔ لیکن اپنی بھیگی ہوئی آنکھیں کماری کے سامنے نہ کر سکا۔

" دیو۔ مجھے معاف کر دو۔"

" یوں نہ کہو۔ کماری جی۔ میں نے تمہیں کبھی کچھ نہیں دیا۔ اب کوشش کروں گا۔"

" نہیں دیو۔"

" کماری!"

" ہاں دیو۔ میں اس قابل نہیں ہوں کہ کسی کی جگہ لے سکوں۔"

" جگہ کا سوال نہیں کماری۔ اب وہ اپنی جگہ کا سوال اُٹھانے نہیں آئے گی۔ یہ تو صرف دل کے قیاس ہیں۔"

"دیو۔ تمہیں کسی سے محبت ہے۔؟"

"ہاں۔"

"میں بھی یہی سمجھی تھی۔ بہت دن ہوئے میں یہی سمجھی تھی۔"

"کماری۔ کیا تم جان گئی تھیں۔؟"

"ہاں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اس کی جگہ لینے کا خیال ہی نہیں کیا۔"

"مگر تم۔ کماری تم۔"

"پتا جی نے غلط کہا ہے کہ کماری تم سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ میں نے کبھی اس طرح نہیں سوچا۔"

"ایک دن تم خود کہہ رہے تھے کہ درویشوں اور راجکماریوں کا راستہ ایک ہونا چاہیئے۔

"ایک راہ سے میری مراد شادی نہیں تھی۔

"بیاہ ایک ساتھ ہے۔ ساتھیوں کا راستہ ایک ہی ہوا کرتا ہے۔"

"صرف شادی ہی تو تنہا ہمدمی نہیں۔"

"اور۔۔۔۔۔؟"

"پہلے تم صرف دیو تھے۔ اب گورو دیو ہو۔" کماری ہنس پڑی۔ پھر بولی۔ "پیار تو دراصل محبوب کی خوشی میں ہے۔ کسی کو چھین لینا یا کسی کی جگہ ہتھیا لینا فتح نہیں۔ پنچھی کو کبھی پنجرے میں بند نہیں رکھا جا سکتا۔"

"کماری۔؟"

"تم حسن ہو۔ مہک ہو۔ ان چیزوں کو پکڑا نہیں جا سکتا۔"

"کماری۔"

"جی۔"

"آج کی کماری پچھلے تمام دنوں سے مختلف ہے۔"

"پہلے کماری دیو کی بھولی تھی۔ آج کماری گورو دیو کی چیلی ہے۔ دیو۔ وہ کسی قدر پیاری ہو گی۔ جس سے تم پیار کرتے ہو۔؟"

"کماری کیا تمہیں بھی اس سے محبت ہے۔؟"

"محبوب کہ جس سے پیار ہو وہ ہمیشہ پیارا لگتا ہے۔ میں نے تم سے یہی سیکھا ہے۔"

"اور کیا سیکھا ہے۔؟"

"اور یہ سیکھا ہے کہ سچے پیار کا حصول کبھی اندوہناک نہیں ہوتا۔ اندیشے، آنسو، غم کو چھپانا، پیار کو ان کی کیا ضرورت ہے۔ یہ سب آرزوئیں ہیں۔ ارمان ہیں۔

کماری کی بیماری دُور ہو گئی۔ کماری کی کمزوری دُور ہو گئی۔ آج کماری کے چہرے پر نُور تھا۔

"آج کماری تم پچھلے تمام دنوں سے زیادہ حسین نظر آ رہی ہو۔"

"وہ کماری پاگل تھی۔ بیمار تھی۔ جو فرقت کے سایہ سے ڈرتی تھی۔ جو اپنے محبوب کو بھینچ بھینچ کر پکڑتی تھی کہ وہ بھاگ نہ جائے۔ کہو آج کی کماری کیسی ہے۔؟"

"بہت ہی پیاری، بہت ہی حسین، بہت ہی بلند۔"

"بس اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں چاہتی۔ میں تمہیں اچھی لگتی ہوں میرے لئے یہی بہت ہے۔"

"نہیں کماری۔ جہاں تک اچھی لگنے کا سوال ہے تم مجھے بہت ہی اچھی لگتی ہو۔ مگر میرا یقین ہے کہ میں کسی کی امانت ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ امانت

مجھے اُسے واپس بھی نہیں دینی ہے۔ اور نہ ہی میں کسی اور کو۔ ... !"

"میں حیران ہوں تم نے پتا جی کے آگے ہاں کیسے کر دی تمہیں "ہاں" نہیں کرنی چاہیئے تھی۔"

"کماری - وہ میری محبت کی کمزوری نہیں تھی - وہ میرے مزاج کی کمزوری تھی - میں اتنے بزرگ اور اتنے پیارے انسان کا دل نہیں توڑ سکتا۔"

"دیو - میں سمجھتی ہوں - تمہاری وہ "ہاں" تمہاری بہت بڑی قربانی تھی۔"

"کماری - تم مجھے پہچانتی ہو - سمجھتی ہو - اگر تم قبول کرو - پتا جی کا دل رکھنا چاہو تو میں تمہارے ساتھ شادی کر سکتا ہوں - بس مجھے اتنی اجازت دے دینا کہ میں ایک تصور کو یونہی دیکھتا رہوں - وہ تصور مجھ سے نہ چھین لینا۔"

"نہیں دیو - میں تم سے وہ نہیں مانگتی - جو تم کسی کو دے چکے ہو۔"

"باقی جو کچھ تم چاہو مجھ سے لے سکتے ہو۔"

"میں نے جو کچھ لیا ہے اور جو کچھ لے سکتی ہوں - اُسے کوئی روک نہیں سکتا - تم بھی نہیں روک سکتے - شادی کے بندھن بھی اس کے لئے بیکار ہیں۔"

"نہیں کماری - میں تمہارے پتا سے "ہاں" کہہ چکا ہوں!"

"لیکن میں تو اُس سے بھی بڑی جیت لے چکی ہوں - مجھے پورا اطمینان ہے۔"

"اے تم کبھی بیمار تو نہیں ہو گی - میری طرف دیکھو - میں ہنس رہا ہوں۔ کھیل رہا ہوں - کھاتا پیتا ہوں - زندگی کو پوری طرح گذار رہا ہوں کسی سے پیار کرتا ہوں - کبھی کبھی جدائی کا دُکھ چپکے سے ذرا تیز ہو جاتا ہے - لیکن اس کے باوجود بھی پُر سکون رہتا ہوں - دُور کہیں گہرائیوں میں ہلچل پیدا ہوتی ہے لیکن پانی کی گہرائی اس ہلچل کو عیاں نہیں ہونے دیتی - ہریالی کی تہ کے نیچے

دھرتی کی کبھی نہ بجھنے والی پیاس پوشیدہ رہتی ہے۔"

"چپ کیوں کر گئے۔ بولتے جاؤ۔ کہتے جاؤ۔ تمہاری پہیلی بھی یوں ہی جئے گی۔ تمہارے تصور سے گھٹیا نہیں ثابت ہو گی۔"

"روتا ہوا پیار اچھا نہیں لگتا راج جی۔"

"آج دیو نے راجکماری کو پہلی بار "راج جی" کے نام سے پکارا تھا۔ راجکماری مسرت کی لہروں میں ڈوب گئی۔

"کماری۔ میں رات کو لکھ رہا تھا۔ اے لامحدودیت۔ میری منزل کبھی نہ آئے۔ اس ادھورے پن ہی میں زندگی ہے۔"

"دیو اُن کا نام کیا تھا؟"

"ممتا۔"

"دیو۔ بھگوان نے ان کو تم سے کیوں چھین لیا۔"

"بھگوان نے نہیں۔ دُنیا نے چھین لیا۔"

"وہ کہاں ہیں۔؟"

"میں نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی۔"

کماری اس سے زیادہ کچھ نہ پوچھ سکی۔ کیونکہ دیو کے چہرے پر ایک اتھاہ دُکھ کی جھلک نمودار ہو گئی تھی۔

"کماری بہت دیر ہوئی۔ تمہاری منگنی کے سلسلے میں کہیں بات چلی تھی۔"

"ہاں۔ یہ تمہیں ملنے سے پہلے کی بات ہے۔"

"مجھے ایک بار پتا جی نے بتایا تھا۔ وہ بات ادھوری کیوں رہ گئی۔؟

"اس لئے کہ مجھے تم میں اپنی زندگی کی تکمیل نظر آئی۔" کماری نے کسی قسم کی جھجک کے بغیر کہا۔ آج دیو اور کماری دونوں دلوں کی اس بلند مقام

منزل پر تھے۔ جہاں عام تجربات کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔

"وہ تکمیل تو اب ادھوری ہی رہ گئی"۔

"لیکن مجھے یوں محسوس نہیں ہوتا۔ مجھے تو تکمیل جیسی راحت مل گئی ہے"۔

"یہ تو اور بھی ٹھیک ہے۔ اپنی راحت اور اطمینان میں سے پتا جی کو بھی جھولی بھر کے راحت دیدو"۔

"وہ کیسے۔؟"

"شادی کا اسی جگہ اقرار کر لو"۔

"مجھے شادی کی واقعی ضرورت محسوس نہیں ہوتی"۔

"نہیں کماری۔ اس تکمیل کا شادی کی ضرورت سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ ضرورت بدستور قائم رہنی چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ تم شادی کر کے اپنے پتا کو پوری وفاداری اور پیار دے سکتی ہو۔ کیونکہ میری اور تمہاری ہمدمی میں یہ دونوں باتیں نہیں ہیں۔

"دیو۔ کیا اس ہمدمی میں پیار بھی نہیں ہے۔؟"

"نہیں۔ اس ہمدمی میں شوہر کا پیار نہیں۔ کیا سوچ کر بتا سکو گی۔؟ کیا تم نے کبھی مجھے شوہر کی صورت میں دیکھا ہے"۔

"نہیں اس صورت میں نہیں دیکھا مگر اس سے بھی عظیم صورت میں دیکھا ہے"۔

"تو پھر شادی سے انکار کیوں کر رہی ہو؟"

"تم نے بھی تو اپنے ادھورے پیار کے بعد شادی نہیں کی"۔

"میری بات اور ہے کماری"۔

"کیوں۔ مجھے ذرا سمجھا دو"۔

"دیو نے سوچا کماری کی تسکین اس کے اپنے راز سے بھی زیادہ ضروری

ہے۔

"کماری۔ ہم ایک دوسرے سے ملے۔ ہمیں یقین تھا کہ زندگی بھر ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے۔ ہمارا رشتہ کچھ یوں تھا جیسے دو سادہ لوح روحیں آپس میں ملتی ہیں۔ اس کی نشانی آج تک میرے پاس ہے۔"

"نشانی۔؟"

"ہاں۔ اس کی یاد۔" دیو نے سر جھکا لیا۔

"میری زندگی تمہاری مرضی کے سوا کچھ بھی نہیں۔؟"

"وہ لڑکا جو پتا جی نے تمہارے لئے چُنا تھا۔ کیسا تھا۔؟"

"بہت اچھا تھا۔ میں اُس لڑکے کو جانتی ہوں۔ وہ ہمارے دُور کے رشتہ دار بھی ہیں۔ وہ بہت اچھا تھا۔ فرق تھا تو صرف یہ کہ وہ تمہارے جتنا اچھا نہیں تھا۔"

"تم وہاں شادی کر لو۔"

"اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو. . . . ."

"یہی بات ٹھیک ہے کماری۔"

"لیکن کسی کے دل کی بات کوئی کیا جانے. . . . . اگر اس نے مجھے تم سے کبھی ملنے نہ دیا تو۔"

"کماری۔ اپنے اوپر بھروسہ رکھو۔ جہاں گناہ کا کوئی احساس نہ ہو۔ وہاں کوئی بھاری رکاوٹ بھی حائل نہیں ہو سکتی۔"

"لیکن کئی بار رکاوٹیں، اندیشے، شکوک خواہ مخواہ گناہ کا احساس پیدا کر دیتے ہیں۔"

"کماری۔ یہ چیزیں بنی بنائی شخصیتوں کے لئے نہیں ہوا کرتیں۔ صرف

عام زندگی میں ہو سکتی ہیں۔"

کماری نے سر جھکائے رکھا۔ بدن میں ایک سکون سا پیدا ہو گیا۔ جیسے ایک بُت بڑے آرام سے پڑا ہو۔ دیو نے آگے بڑھ کر کماری کے دونوں ہاتھ اُٹھا کر اپنے ہونٹوں سے لگا لئے۔

"کماری دل کو مضبوط کرو۔"

وہ مسوری سے واپس آ گئے۔ راجکماری کی شادی رچائی گئی۔ اُس لڑکے کا نام سوم ناتھ تھا۔ راجکماری نے بتایا کہ سومناتھ اُسے پسند تھا بہت ہی پسند۔ شادی کا دن آگیا۔ راجکماری نے عروسی جوڑا پہنا۔ سر سے پاؤں تک ریشم اور زری کی سُرخ اور رپہلی جھلک نے راجکماری کو ایک نیا حسن عطا کر دیا۔ کماری نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ تنہائی ہوتے ہی کماری قد آدم آئینہ کے سامنے کھڑی رہی۔ پاس ہی میز پر سومناتھ کی تصویر پڑی ہوئی تھی۔ راجکماری کو یوں محسوس ہُوا جیسے سومناتھ ایک دیوتا تھا۔ شاید گجرات کے سومناتھ مندر کا دیوتا۔ راجکماری اُس کی داسی تھی۔ دیوداسی! رقاصہ کا روپ اور رقاصہ کا دل راجکماری کو اپنے باطن میں سمایا ہُوا محسوس ہو رہا تھا۔

آج رقاصہ اپنے دیوتا کے مندر میں داخل ہو رہی تھی۔ زندگی بھر کے لئے فن ہی اس کی زندگی تھا۔ حسن ہی اُس کی زندگی تھی۔ اُس نے آج اپنے دیوتا کے قدموں میں حسن اور فن کی بھینٹ دینی تھی۔ دیوداسی۔ جیسے پھر کبھی سومناتھ کے مندر سے باہر نہیں نکلنا تھا۔

کماری کے دل میں ایک عجیب قسم کی جلن تھی مگر وہ تو رقاصہ تھی۔ فن اور حسن کی دیوی۔ راجکماری جھک گئی۔ سومناتھ کی تصویر بھی آگے کی طرف جھکی۔ ایک بُت آگے جھُکا۔ دھک دھک کرتے ہوئے دل میں راجکماری نے اپنی ساری جلن کو سمیٹ لیا۔ یعنی اپنے سومناتھ کی دیوداسی نے اپنا تن من وار دیا۔

بیاہ کے سارے منتر پڑھے جا چکے تھے۔ راجکماری کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ نہ آنسو تھے نہ مسکراہٹ۔

جب راجکماری کے یہاں بیٹی ہوئی تو راجکماری پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر اور نرسوں کو گئے ہوئے ابھی ایک ہی گھنٹہ ہُوا تھا۔ دیو کمرے میں داخل ہُوا راجکماری کے پہلو میں ایک ننھی سی بچی لیٹی ہوئی تھی یسوم ناتھ کماری کے سرہانے بید کی کرسی پہ بیٹھا ہوا تھا۔ دیو نے بچی کی حسین و جمیل صورت دیکھ کر کہا۔ بڑی شیریں بچی ہے۔"

کماری کے دُبلے چہرے پہ ہنسی نمودار ہوئی۔" اچھا تو اس کا ایک شیریں سا نام رکھ دو۔"

رخصتی کا وقت آگیا۔ پتا نے راجکماری کو پیار کیا۔ راجکماری نے وہ پیار قبول کر لیا۔ نہ کماری روئی اور نہ ہی ہنسی۔

کمرے میں کماری تھی۔ سوم ناتھ تھا۔ کماری کا پتا تھا۔ دیو تھا۔ اور کچھ نزدیکی رشتہ دار تھے۔ وداع کا وقت تھا۔ راجکماری دیو کے قریب آئی۔ دونوں ہاتھ جوڑے، آنکھیں جھکی رہیں۔ پیشانی بھی ذرا سا جھکی۔ کماری بولی نہیں لیکن کماری کے روئیں روئیں سے ایک آواز آرہی تھی ''

"الوداع دیو۔ اگر حکم ہو تو۔" اور یہ آواز دیو کی رگ رگ میں سما گئی۔

"شیریں مدھو" دیو کے منہ سے نکلا۔ اس دن کے بعد سے راجکماری کی بچی کو بھی مدھو کہہ کر بلانے لگے۔

اب دیو آتا ۔ مدھو کو کھلاتا۔ مدھو ایک کھیل تھی جس کے گرد بیٹھ کر تینوں کھلاڑی کھیلا کرتے ۔

پہلے دیو اکیلا آیا کرتا تھا۔ لیکن اب اس کے ساتھ اس کے دوست کا بیٹا منو بھی آیا کرتا تھا۔ منو اگرچہ مدھو سے بہت بڑا تھا۔ وہ دونوں کھیل میں ساتھی بھی نہیں بن سکتے تھے۔ مگر مدھو پھر بھی جھنجھنے، ربڑ کے گیند یعنی چھوٹے چھوٹے کھیلوں میں حصہ لے کر مدھو کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ منو کی کوئی چھوٹی بہن یا کوئی چھوٹا بھائی نہیں تھا۔ گھر میں اس کا دل نہ لگتا۔ جب بھی دیو گھر میں یہ بات کہتا کہ وہ کماری کے یہاں جا رہا ہے۔ تو منو بھی ساتھ جانے کے لئے تیار ہو جاتا۔

اس طرح کماری کے گھر، سرلا کے گھر اور دیو کے گھر کی سانجھ بڑھتی گئی۔ منو اب اسکول جانے لگا تھا۔ اسکول کے سبق اپنے چچا دیو کو سنایا کرتا تھا۔ دیو اس کا چچا تھا۔ اُستاد تھا۔ دیو اس کا دوست تھا۔ وہ دیو کے ساتھ کھیل کر بہت خوش ہوتا تھا۔

منو اپنے چچا دیو کے ساتھ آتا تو کماری اُسے دیکھا کرتی۔ منو اپنے چچا کو بہت عزیز تھا۔ کماری کو بھی منو بہت پیارا لگتا۔ کماری کے دل کی گہرائیوں میں ایک ہلچل پیدا ہو جاتی ۔ ایک پاکیزہ خیال اُبھرتا۔ اگر بڑے ہو کر منو اور مدھو ایک دوسرے کے نزدیک رہے۔ تو شاید زندگی کی کوئی اٹوٹ ہمدمی ان دونوں کے درمیان پیدا ہو جائے ۔

رنجو ایک برس کی ہو گئی۔ رنجو دو برس کی ہو گئی۔ رنجو گھٹنوں کے بل چلنے لگی۔ رنجو دوڑنے لگی۔ رنجو اسکول گئی۔ رنجو کالج میں داخل ہو گئی۔

چھ برس ہوئے جگدیش نے ایک اور شادی کر لی تھی۔ جگدیش کی ماں اپنے دولت مند بیٹے کی اُداس زندگی دیکھ کر رویا کرتی تھی۔ اس نے ایک لڑکی تلاش کی۔ جگدیش نے ماں کو من مانی کرنے کی اجازت دیدی۔ ماں نے بیاہ رچا دیا۔ جگدیش نے شادی کر لی۔ کچھ دن گزر گئے۔ جگدیش کے یہاں نہ کوئی بیٹا ہُوا نہ کوئی لڑکی۔ جگدیش کی بیوی اپنے بھتیجے کو گود لینا چاہتی تھی۔ لیکن جگدیش نہ مانا۔ اس کی بیوی کچھ ناراض رہنے لگی۔ زیادہ تر میکے میں رہتی۔ جگدیش کو گھوڑ سواری کا شوق اپنے والد سے ملا تھا۔ اب کے جب

جگدیش، اس کی نئی بیوی اور رنجو شملہ گئے۔ تو جگدیش نے خوب گھوڑ سواری کی۔

ایک روز جگدیش کی بیوی کو سردی لگ گئی۔ وہ سیر کے لئے نہ گئی۔ رنجو اُس کے پاس رہی۔ جگدیش گھر میں شام نہ گذار سکا۔ وہ ایک گھوڑی کرایہ پر لے کر سیر کو نکل گیا۔ مشوبرہ جانے والی سڑک پر اُس نے گھوڑی کو خوب دوڑایا۔ نچلی سڑک کے اوپر ایک بس جا رہی تھی۔ پہاڑی کے گول موڑ کو پار کرتے ہوئے بس نے ہارن بجایا۔ ہارن کی گونج کو پہاڑوں کی تنہائی نے اور بہت سی گونجیں عطا کر دیں۔ گھوڑا چمک کر اُچھلا۔ چھوٹی سی سڑک کے ساتھ بہت گہری کھڈ تھی۔ گھوڑے کا پیر پھسلا اور وہ سوار سمیت کھڈ میں جا گرا۔

اس حادثہ کی خبر گذرتی ہوئی بس کو معلوم ہو گئی۔ وہ رُک گئی۔ بس کے مسافر بھی ٹھہر گئے۔ کچھ پہاڑی لوگوں کو جمع کیا گیا۔ لوگ کھڑے ہو کر موت کا بھیانک ذکر کرتے رہے۔ کچھ پہاڑیئے کھڈ کی بل کھاتی ہوئی پگڈنڈیوں پر سے نیچے اُترے۔ گھوڑا اور اس کا سوار ہونی کے شکار کی طرح گرے پڑے تھے۔ گھوڑے میں جان کی رمق تک باقی نہیں تھی۔ سوار کی ٹانگوں پر کوئی پتھر لگا تھا۔ اور وہ لہولہان پڑا تھا۔ سوار کا سر گھوڑے کے پہلو پر ٹکا ہوا تھا۔ اور صحیح و سالم تھا۔ پہاڑی لوگوں نے سوار کو اُٹھایا۔ پیٹھ پر لاد لیا۔ ایک دوسرے کے سہارے اُسے کھڈ سے نکال لائے۔ لوگوں نے اُسے ہسپتال پہنچایا۔ ہسپتال والوں نے اس کی جیب کے کاغذات سے اس کا پتہ معلوم کیا اور اس کے گھر خبر بھجوا دی۔

جگدیش کی بیوی بہت پریشان ہوئی۔ جگدیش کا علاج ہوتا رہا۔ جگدیش کی جان بچ گئی۔ لیکن اُس کی دونوں ٹانگیں بیکار ہو گئیں۔ مفلوج ٹانگوں والے

اس شخص کے لئے ایک ہتھ گاڑی بنوائی گئی۔ وہ سب پہاڑ سے واپس آ گئے۔ اپنے گھر لاہور ــــــــ

جگدیش کی زندگی عجیب و غریب ہوگئی۔ اپنے کارندوں کو بلاکر انہیں سارے کام سمجھاتا اور اس سلسلے کو چلائے جاتا مگر زندگی کے دیگر کاموں سے وہ محروم ہوگیا۔

اداسی اور بھی گہری ہوگئی۔ جگدیش کی بیوی نے بہت کہا کہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں بیٹی اپنے گھر چلی جائے گی۔ بیٹا کوئی ہے نہیں۔ جائیداد رشتہ داروں کے ہتھے چڑھ جائے گی۔ اُس نے بہت اصرار کیا کہ اس کے بھتیجے کو گود میں لے لیا جائے۔ اب اُسے کامل یقین تھا کہ جگدیش زندگی کی یہ چوٹ سہہ کر ضرور بدل گیا ہوگا۔ اُس نے یہ دلیل بھی پیش کی کہ اس محتاج زندگی کے بڑھاپے میں تو آدمی یوں ہی دوسروں کا دست نگر ہو جاتا ہے۔ اور جب ٹانگیں نہ ہوں تو۔ . . . .

لیکن جگدیش کا دل بالکل تبدیل نہ ہُوا۔ بیوی کی آرزو بھی ادھوری رہ گئی۔ اس نے اپنا دل اور بھی میلا کر لیا۔ "بیٹی سے کہا کہ کنواری رہے۔ باپ بیٹی اکٹھے رہا کرنا۔ تمہیں کوئی تیسرا آدمی اچھا ہی نہیں لگتا۔ میں خود بہت بری ہوں کہ بار بار تمہارے درمیان آجاتی ہوں۔" ایک دن جگدیش کی بیوی رُوٹھ کر میکے چلی گئی۔ رنجو کالج میں بمشکل تنہا رہتی۔ باقی سارا دن وہ اپنے پتا سے الگ نہ ہوتی۔ وہ کالج چھوڑ دینا چاہتی تھی۔ مگر جگدیش نے ایسا نہ ہونے دیا۔ ہر گھڑی رنجو کے پاس رہنے کے باعث جگدیش کی زندگی کے لمحات مسرت انگیز ہو گئے۔ رنجو اخبار پڑھتی جگدیش سُنتا۔ رنجو گاتی ــــ جگدیش سنتا۔ جگدیش گاڑی میں بیٹھا رہتا۔ رنجو اپنے ہاتھوں سے اُس

گاڑی کو باغیچے میں لے جاتی۔ کسی نوکر کو ہاتھ نہ لگانے دیتی۔ باغ میں پھول توڑتی۔ پتا کی قمیص میں لگا دیتی۔ نئی کیاریاں بناتی۔ نئے پھول لگاتی۔ باپ بیٹی روز پھولوں کے قریب بیٹھتے۔ نئے غنچے گنتے رہتے۔ نئے شگوفوں کو پرکھتے رہتے۔ نئے پھولوں کا ذکر کیا جاتا۔ ایک آدمی بات کرتا اور دوسرا اُسنتا رہتا۔

رنجو کو معلوم تھا کہ جس ماں نے اُسے جنم دیا تھا۔ وہ زندہ تھی۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ اُس کے پتا اس کا ذکر کرنے یا اُس کا ذکر سُن کر خوش نہیں ہُوا کرتے تھے۔ رنجو نے کبھی اُس اُٹھا کر رکھی ہوئی کہانی کو چھیڑا نہیں تھا اُسے اپنا پتا اچھا لگتا تھا۔ اپنے ابا کے اتنے اچھے طور واطوار اتنے نرم دل اور اتنے ذی ہوش دماغ میں اُسے کوئی قصور نظر نہ آتا۔ جس سے اُسے یہ احساس ہوتا کہ اس کے پتا نے کوئی زیادتی کی ہوگی۔ وہ خاموش رہتی۔ اب اُس کا پتا زندگی کے دو اہم اعضا سے محروم ہو گیا تھا۔ وہ دکھی تھا۔ رنجو نے اپنی تمام تر توجہ اور وقت اس کے حوالے کر دیا۔ اُس نے حلف اُٹھایا کہ وہ اپنی زندگی کے آخری سانس تک اپنے پتا کو کوئی قلت یا کمی محسوس نہیں ہونے دے گی۔ وہ اسی صورت میں بیاہ کرے گی۔ اگر اس کا شوہر بھی اس کے پتا کا عزیز بن سکے گا۔ ورنہ وہ کبھی شادی نہیں کرے گی۔

آج جب دونوں باپ بیٹی پھولوں کی کیاریوں میں بیٹھے تھے۔ تو رنجو نے نئے پھولوں کی صورت دیکھتے دیکھتے پھولوں کے متعلق اپنی نئی واقفیت بیان کرنے کے لئے ایک نئی خریدی ہوئی کتاب نکال کر دکھائی۔ جگدیش نے وہ کتاب دیکھی مگر بات کو طول نہ دیا۔

”رنجو۔ کبھی کبھی کیا تیرا یہ جی نہیں چاہتا کہ تو اپنی ماں کے بارے میں

کچھ سُننے۔" جگدیش نے آہستگی سے پوچھا۔ یہ سوال یوں ہی رواداری میں کیا گیا تھا۔ رنجو خاموش ہو گئی۔ اس نے کبھی اپنے آپ کو اس سوال کے لئے تیار ہی نہیں کیا تھا۔ وہ تو سوچتی تھی اگر کبھی ضرورت ہوئی تو یہ سوال وہ خود کرے گی اور پتا کو اس کا جواب دینا ہوگا۔ لیکن آج الٹی ہی بات ہو گئی تھی۔"

"کیوں رنجو۔؟"

"آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔؟"

"نہیں رنجو۔ مجھے بتاؤ۔"

"میں تو آپ کو جانتی ہوں۔ آپ بہت اچھے انسان ہیں۔ اور کچھ جاننے کے لئے جی نہیں چاہتا۔" رنجو نے پیار سے اپنے پتا کی گردن میں باہیں ڈال دیں۔

"رنجو میں اچھا ہوں۔ تم اچھی ہو۔ اس لئے جس نے تجھے جنم دیا ہے۔ وہ بھی تو اچھی ہی ہوگی۔ کیا تم نے یہ بات کبھی نہیں سوچی۔؟" جگدیش نے تھوڑی دیر کے بعد کہا۔

رنجو کیونکر انکار کر سکتی تھی۔ کہ اُس نے کبھی کچھ نہیں سوچا تھا۔ یہ ٹھیک تھا کہ اُس نے اپنی سوچ کو اپنے پتا کی مسرت پر قربان کر دیا تھا۔

"آج آپ میری کتاب تو دیکھئے۔ میں کہاں سے خرید کر لائی ہوں۔ کبھی پھر وہ باتیں کریں گے۔" رنجو بولی۔ اُس نے بنا پھول توڑا اور پتا کے آگے بڑھا دیا۔ جگدیش نے وہ پھول لے لیا۔ اُسے بوسہ دیا اور سمجھا کہ رنجو اس کی پیاری بیٹی اپنی ماں کے بارے میں ضرور سوچتی ہوگی۔ جبھی تو وہ جواب دینے سے گھبرا رہی تھی۔

"رنجو۔ تمہاری ماں بہت اچھی تھی۔ مجھے افسوس ہے کہ وہ تیری زندگی میں داخل نہ ہو سکی۔ اتنی اچھی ماں کی کمی تیری زندگی کی محرومی ہے۔"

"میری زندگی میں کوئی محرومی نہیں۔ آپ نے سب محرومیاں پوری کر دی ہیں۔" رنجو نے پیار سے کہا۔ "اور وہ ..... " رنجو کچھ کہتے کہتے رُک گئی آخر کار اُس نے حوصلہ کر کے پوچھ ہی لیا۔" وہ میری زندگی میں کیوں داخل نہ ہو سکی۔؟"

جگدیش کوئی جواب نہ دے سکا۔ ایک سرد آہ بھر کر رہ گیا۔ رنجو اور بھی زیادہ مشکل میں مبتلا ہو گئی۔ پتا بھی اچھا تھا۔ ماں بھی اچھی تھی۔ تو پھر بُرا کون تھا۔؟ تقدیر کیوں اتنی بُری ہو گئی۔ بھگوان اُن کا ملاپ نہ کرا سکا۔؟

"رنجو۔ آج ایک ان ہونی بات کو ہونی میں تبدیل کر دینے کو جی چاہتا ہے۔"

"کیا کہا پتا جی۔؟"

جگدیش خاموش رہا۔ رنجو منتظر رہی۔ جگدیش سوچتا رہا۔" وہ کہا کرتی تھی۔ میری ممتا کہا کرتی تھی۔ راستے جُدا ہو گئے۔ ضرورتیں ختم ہو گئیں۔" وہ اس راستہ پر پھر نہیں آئے گی۔ حکم یا التجا اُسے اب واپس نہیں لا سکتے۔" اور جگدیش سوچتا رہا۔ اُسے حکم دینے یا التجا کرنے کا اختیار ہی کیا ہے.....؟ اٹھارہ برس ہو چکے ہیں۔ زندگی کا پہاڑ جیسا وقت بیت چکا ہے۔ جوانی بھی ڈھل گئی۔ بدن بھی دھوکا دے گیا۔ اب وہ ایک محتاج، بے آسرا بدن کا بُت بے کر بیٹھا ہوا ہے۔ اٹھارہ برس تک اُس نے ممتا کی سُدھ نہ لی۔ خبر نہیں کہ اس نے اتنے برس رو کر یا ہنس کر گذارے ہیں۔ اگرچہ اُسے معلوم تھا کہ وہ ہنس نہیں سکتی تھی۔ اور رونا اس کا مزاج نہیں تھا۔ لیکن اس

نے تو کبھی اُس کی سُدھ نہ لی۔"

اُسے معلوم تھا کہ ممتا اسکول میں ہے۔ نوکری کر رہی ہے۔ بس اور کچھ نہیں کرتی۔ اس نے ماں باپ کے یہاں پناہ نہیں ڈھونڈی۔ اُس نے شوہر سے امداد نہ طلب کی۔ وہ اپنے عاشق سے دوبارہ ملی نہیں۔ ایسی عورت لاکھوں میں ایک ہوتی ہے۔

جگدیش نے سوچا ممتا تو عمر بھر یوں ہی رہی۔ مگر اُس نے شادی کر لی۔ یہ قدرت کا کھیل تھا کہ اُس کے یہاں کوئی اولاد نہ ہوئی۔ شاید اس شادی میں اس کا اپنا دل شامل نہیں تھا۔ شاید قدرت نے اُس کی مدد کی یا یوں ہی......

اور پھر جگدیش نے دل میں سوچا۔ ممتا نے کسی سے پیار کیا۔ پیار منڈھے نہ چڑھا۔ اُس نے مجھ سے شادی کر لی۔ بیاہ بھی اُس کی مرضی سے نہ ہُوا بلکہ کروایا گیا..... اور میں.....؟ میں نے بھی ممتا سے پیار کیا۔ جانے یا اَن جانے۔ پیار کا جواب پیار سے نہ ملا۔ میں نے دوسری شادی کر لی۔ میں نے شادی جان بوجھ کر کی۔ میں اپنی نئی بیوی سے پیار نہیں کرتا تھا۔ مگر بیاہ کر لیا۔ میں اُس سے زیادہ قصور وار ہوں۔ وہ مجھ سے زیادہ قصور وار نہیں۔"

"ہاں تو رنجو میں کہہ رہا تھا۔ کہ آج ایک اَن ہونی بات کو ہونی میں تبدیل کر دینے کو جی چاہتا ہے۔" جگدیش نے پھر کہا۔

"کیا کہا پتا جی۔؟"

"رنجو اگر تیری ماں تجھے مل جائے تو تم کیا محسوس کرو گی۔؟"

"لیکن میں تم سے جُدا نہیں ہو سکتی۔"

"پگلی۔ میں نے یہ کب کہا ہے کہ تم مجھ سے جدا ہو جاؤ۔"

"مگر ۔"

"تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا یہ بات نہیں ہو سکتی۔؟"

"مجھے کیا خبر پتا جی۔"

"پتہ نہیں رنجو۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں اُسے دیکھے بغیر زندہ تو رہ سکتا ہوں۔ مگر اُسے دیکھے بغیر مر نہیں سکتا۔" جگدیش کا گلا بھر آیا رنجو کچھ نہ کہہ سکی۔

"میں گھوڑے پر سے گرا تھا۔ شاید میں اسی لئے مر نہ سکا۔ تیری نئی ماں کا کوئی قصور نہیں۔ میں اس کے نزدیک نہ جا سکا۔ وہ مجھے کبھی سمجھ نہیں سکتی۔

اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جن آنکھوں میں تیری ماں جیسی عورت ایک بار سما جائے۔ کئی بار شادی کرنے پر بھی ان آنکھوں میں اور کوئی سما نہیں سکتا۔" جگدیش نے آج رنجو کے سامنے اتنا کچھ کہہ دیا۔

رنجو آہستہ آہستہ اپنے پتا کے سر پر پیار کی تھپکیاں دے رہی تھی۔ آج جگدیش بھوکا تھا۔ بہت بھوکا۔ بیٹی کی انگلیاں اس کے سر میں تھیں۔ مگر وہ کافی نہیں تھیں۔ آج وہ چاہتا تھا کہ ممتا آجائے۔ ایک بار وہ آجائے۔ اس کے محتاج بدن کا وہ سہارا بن جائے۔ ممتا جو سہارا دے نہیں سکتی تھی دے ضرور سکتی تھی

رنجو نے پتا کو جھنجھوڑ دیا کہ وہ کہیں سوچ میں منجمد ہی نہ ہو جائے۔

"وہ کہاں ہیں پتا جی۔؟"

"ایک اسکول میں۔ مجھے اس کی ہمیشہ خبر رہی ہے۔ لیکن میں کبھی اس کے

نزدیک نہیں گیا۔"

"تم جو چاہو۔ میں کر سکتی ہوں۔"

"ایک خط لکھ دیں۔۔۔۔۔؟۔۔۔۔۔شاید۔۔۔۔۔"

"اگر تم حکم دو تو میں کسی کو بھیج سکتی ہوں۔"

"نہیں۔ کسی کو بھیجنا اس کی ہتک ہے۔"

"تم جا نہیں سکتے۔ میں جا سکتی ہوں۔"

"نہیں رنجو۔ میں تمہارا واسطہ دے کر اُسے نہیں بلوانا چاہتا۔ میں صرف اس سے اپنی ضرورت بیان کرنا چاہتا ہوں۔"

اس کے بعد رنجو کاغذ اور قلم لائی۔ جگدیش نے کچھ لکھا۔ نہ جانے کیا لکھا۔ رنجو نے یہ جاننے کی کوشش نہ کی۔ چٹھی ڈاک سپرد کر دی گئی۔ جگدیش کا دل دھڑکتا رہا۔ دن دھڑکتے رہے۔ راتیں دھڑکتی رہیں۔

تیسرے دن کی شام کو جگدیش اپنے باغیچے میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ رنجو پتا کے لئے چائے لانے گئی ہوئی تھی۔ بڑے پھاٹک سے گذر کر کوئی اندر آیا۔ ایک عورت کا بُت۔

جگدیش کا سانس زور زور سے چلنے لگا۔

جگدیش کے کندھے پر جیسے پَر اُگ آئے تھے۔ دھرتی بہت پیچھے رہتی جا رہی تھی۔ جگدیش خود کو آسمان کی وسعت میں اُڑتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔۔۔۔ اور اُس کے پاؤں دھرتی پر نہیں پڑ رہے تھے۔ ان اُڑتے ہوئے پروں کا کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ نہ جانے اُڑا دیں۔ گرا دیں۔

پُرسکون، نرم و نازک، سادہ اور پاکیزہ۔ اٹھتیس سال کی حسین و جمیل

ممتا آہستہ آہستہ قدم رکھتی ہوئی آ رہی تھی۔ فاصلہ کم ہوتا گیا۔ وہ جگدیش کے باغیچے کی طرف آ گئی۔ جگدیش کی ٹانگیں ہی نہیں تھیں۔ وہ اٹھ نہیں سکتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کس طرح اس کا سواگت کرے۔

ممتا نے ساری جھجک دُور کر دی۔ جگدیش کی پیٹھ کے پیچھے کھڑے ہو کر اُس نے اُس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

جگدیش کی آنکھوں سے آنسو گرے اور اس کی قمیض پر پڑنے لگے۔

جگدیش نے سوچا یہ بہت اچھا ہوا کہ ممتا اس کے چہرے کے سامنے نہیں تھی۔

"تم آگئیں"۔ جگدیش نے سنبھل کر کہا۔

"مجھے "تم" کہہ کر کیوں بلا رہے ہو۔ جبکہ "تو" کہہ کر مخاطب کرتے رہے ہو۔"

"مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔

"کیا تمہیں اُمید نہیں تھی۔ تم بلاؤ اور میں نہ آؤں۔"

"اتنی مدت گذر چکی ہے۔۔۔۔۔۔"

"تم نے کبھی یہ بتایا ہی نہیں کہ تمہیں میری ضرورت ہے۔ آج تم نے بلایا اور مَیں آ گئی۔"

"ممتا تو کہے گی۔ جب بدن صحیح و سالم تھا۔ جب بھرپور شباب تھا۔ میں نے دوسری شادی کر لی۔ آج جب بدن بے آسرا ہو چکا ہے۔ جوانی کا سورج ڈھل چکا ہے۔ مجھے تمہاری ضرورت محسوس ہونے لگی ہے۔"

"مجھے شکوہ کرنے کا کوئی حق نہیں۔"

"ممتا جب میرا بدن صحیح و سالم تھا۔ اس وقت بھی میرا دل صحیح و سالم نہیں تھا۔"

"میں جانتی ہوں۔"

وہ تھوڑی دیر تک خاموش رہا۔

مجھے ڈر تھا کہ تو سمجھے گی یہاں آنے سے تیرے وقار پر ضرب پڑے گی۔"

"میرا وقار اتنا کچا نہیں۔ جو اس ضرب سے ٹوٹ جائے۔"

"میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ میں سوچتا ہوں میں نے غلطی کی مجھے تیری ضرورت تھی یا نہیں۔ مگر رنجو کو تیری ضرورت ہے۔ میں نے بیٹی سے ماں کو جدا کر دیا۔ اتنی اچھی ماں اُس سے جدا کر دی۔"

ممتا کے خیالوں میں بیٹی کا بُت نمایاں ہوا۔ آنکھوں نے اسے دیکھنا چاہا مگر وہ نگاہوں سے اوجھل تھا۔

"میرے بعد اس دُنیا میں اُس کا کوئی نہیں ہوگا۔ میری خاطر نہ سہی۔ اس کی خاطر اس کی ماں اُسے لوٹا دو۔" دو دن پہلے جگدیش یہی سوچ رہا تھا۔ ممتا کو واپس بلانے کے لئے رنجو اپنا واسطہ نہیں دے گا۔ صرف اپنی ضرورت کا اظہار کرے گا۔ آج وہ بہت ہی انکسار پسند ہوگیا۔ وہ ممتا کو کسی قیمت پر واپس نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔

"اگر میرے پاس تمہارے لئے بھی کچھ ہے تو میں اُسے بھی لوٹا سکتی ہوں۔ اور جو کچھ اُس کے لئے میرے پاس ہے اُسے بھی لوٹا سکتی ہوں۔"

جگدیش نے ممتا کا ہاتھ کھینچ کر ہونٹوں سے لگالیا۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ ساری ممتا کو اپنے روئیں روئیں میں سمالے۔

دونوں کی پیٹھ دوسری طرف تھی۔ رنجو چائے لے کر آگئی۔ اس نے ماں کی پیٹھ دیکھی۔ چائے کی طشتری ہاتھ میں پکڑی رہ گئی۔ پیروں تک ایک کپکپی چھڑ گئی۔ آنکھوں میں زبردستی آنسو آ گئے۔ رنجو سنبھلی۔ آگے بڑھ کر چائے کی طشتری

میز پر رکھ دی اور پھر چپکے سے ممتا کے ساتھ بغلگیر ہو گئی۔

"ماں" رنجو نے اپنا چہرہ ممتا کے بازو سے لگا دیا۔ ممتا نے زور سے بھینچ کر رنجو کو گلے سے لگا لیا۔ ممتا بیٹی کی برسوں کی بھوک کو پہچانتی تھی۔ اس کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا۔ اُس نے رنجو کو اپنے سینے سے لگائے رکھا۔

جگدیش کہتا۔ اُس نے اپنی ٹانگیں تو کھو دی تھیں۔ مگر اس کی زندگی پلٹا کھا گئی تھی۔ اُس نے ممتا کو پا لیا تھا۔ ویسے وہ شاید عمر بھر ممتا کو بلوانے کا بہانہ ڈھونڈ نہ سکتا۔

جگدیش کی بیوی نے یہ دھمکی ارسال کی کہ وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے گی۔ خرچہ مانگے گی۔ جائیداد میں اُس کا حصّہ ہونا چاہیئے۔ جگدیش ہنس پڑا۔ اُس نے مکان، کوٹھیاں، باغ اور نہ جانے کتنا کچھ اس کے نام لکھ دیا۔ اس حرص اور خواہش سے بھی بہت زیادہ۔

جگدیش گاڑی میں بیٹھتا۔ جگدیش پلنگ پر لیٹتا۔ ممتا ہر گھڑی اس کے پاس رہتی۔ جگدیش ممتا کے ہاتھ سے نہاتا، کھاتا، اُٹھتا اور بیٹھتا۔ یہ محتاجی بہت پیاری معلوم ہوتی۔ ممتا نے اس کے روگ کو زندگی میں تبدیل کر دیا۔

رنجو کالج سے آتی تو اس کی ماں اور اس کا باپ کبھی باغیچے کے اندر بیٹھے اور کبھی تاش کھیلتے ہوئے ملتے۔ کبھی کتابیں پڑھ رہے ہوتے۔ رنجو خوشی سے باغ باغ ہو جاتی۔ دونوں کے گلے سے لپٹ جاتی دونوں کو آغوش میں بھینچ لیتی۔

جگدیش کو اب پتہ چلا کہ ایک بچے کی زندگی نہ صرف باپ کی وجہ سے ادھوری رہتی ہے بلکہ ماں کی وجہ سے بھی نامکمل رہتی ہے۔

ہر ایک بات اپنی ڈگر پر چل پڑی اور زندگی بڑھتی رہی۔ دھرتی سورج کے گرد چکر کاٹتی رہی۔ بہاریں آئیں اور بہاریں بیت گئیں۔

ڈاکٹر دیوراج کے ہسپتال میں مریض آتے۔ شفایاب ہوتے اور چلے جاتے۔ اپنے۔ اپنے پلنگ۔ اپنے وارڈ دوسرے لوگوں کے لئے خالی کر جاتے۔

جگدیش چندر کا شباب گذر گیا۔ ممتا کی جوانی بیت گئی۔ ان کی بیٹی رنجو جوان ہو گئی۔

کرشن لال کی جوانی ڈھل گئی۔ سرلا کی جوانی گذر گئی۔ اُن کا بیٹا منو جوان ہو گیا۔

راجکماری کی جوانی بیت گئی۔ اس کے پتی کا شباب گذر گیا۔ ان کی

بیٹی مدھو جوان ہو گئی۔

پُرانی جوانیوں نے نئی جوانیوں کے لئے جگہ خالی کر دی۔

سورج کی کشش سے بندھی ہوئی دھرتی کئی چکر کاٹ چکی تھی۔ مدھو کالج میں پڑھنے لگی۔ منو ڈاکٹری کا امتحان دے رہا تھا۔ ڈاکٹر دیو کے لئے راجکماری کی عقیدت بدستور قائم تھی۔ منو ڈاکٹر دیو کو بہت عزیز تھا۔ اس لئے منو راجکماری کو بھی عزیز تھا۔ ویسے بھی منو میں ڈاکٹر دیو کی تمام صفات بہت اُجاگر ہوئی تھیں۔ وہ ڈاکٹر دیو کی تمام خوبیاں اپنے مزاج میں رچائے چلا جا رہا تھا۔ بالکل اُس جیسا بنتا جا رہا تھا۔ راجکماری کو وہ بہت پیارا لگتا۔

مدھو ایک روز کالج سے لوٹی۔ ایک گھنٹہ کے بعد اُسے اپنی ایک سہیلی کے یہاں چائے پینے جانا تھا۔ کالج کی کتابیں رکھ کر وہ جانے کی تیاریاں کرنے لگی۔ منہ دھویا۔ اپنے کمرے میں بڑے آئینہ کے آگے کھڑی ہو کر بالوں میں کنگھی کی۔ اس کے بال گھنے اور گھنگریالے تھے۔ بالوں کے اُبھار تلے اُس کا گول چہرہ بہت ہی دلکش تھا۔ اُس کی رنگت بھی ریشمی اور گلابی تھی۔

مدھو کی ماں نے اُسے دُور سے دیکھا۔ راجکماری کے حُسن سے بھی زیادہ مدھو حسین تھی۔ ویسے بھی ایک عورت کی ڈھلتی شام اپنے بچے کی چڑھتی صبح میں پناہ لیتی ہے۔ مدھو آئینہ کے سامنے کھڑی کھڑی پاس پڑی ہوئی میز کی طرف دیکھنے لگی۔ میز پر دو تین چھوٹی چھوٹی تصویریں پڑی تھیں۔ ایک تصویر منو کی تھی۔ منو جوانی کی ایک سڈول مورت تھا۔ مدھو دیکھتی رہی۔ دیکھتی رہی۔ شاید اپنی اور منو کی خوبصورتی کا موازنہ کر رہی تھی۔

راجکماری دُور ہی سے دیکھ رہی تھی۔ پھر مدھو اپنی الماری میں سے کپڑے نکال نکال کر انتخاب کرنے لگی۔ شاید فیصلہ نہ کر سکی۔ اُس نے ماں کو آواز دی۔

راجکماری نے جا کر مدھو کے لئے ساڑھی نکال دی۔ ساڑھی کے کناروں پر زری کی ایک باریک دھاری تھی۔ مدھو نے اپنی وہ جوتی نکالی جس پر سنہری کام ہُوا تھا۔ مدھو ساڑھی باندھتی رہی۔ ماں کی آنکھوں سے تعریف چھلکتی رہی۔

ساڑھی پہنتے ہوئے مدھو کی نگاہ پھر منو کی تصویر پر پڑی جب مدھو تیار ہو گئی۔ تو اُس نے اچانک ماں کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ اپنے حسن کا شعور مدھو سے شاید تنہا سنبھالا نہیں جا رہا تھا۔ اُس نے ماں کی گود میں سہارا لیا۔ جس نے اس وجود کو جنم دیا تھا۔ ماں نے اُسے اپنی آغوش میں بھینچ لیا۔ اس کے کندھے پر بوسہ دیا۔

"مدھو اب تو کسی چور کو بُلوانا پڑ گیا۔"

"چور کو ——"

"ہاں۔ جو آئے اور میری پُونجی کو چُرا کر لے جائے۔"

ماں کے پُر تپاک پیار میں بھیگ کر مدھو نے آج ماں سے کچھ پوچھنا چاہا اور بتانا چاہا۔

"ماں —— تم نے پتا جی کو کیسے چُنا تھا؟"

راجکماری اِس براہ راست سوال کے لئے تیار نہیں تھی۔ وہ فوراً کوئی جواب نہ دے سکی۔ پھر اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ جواب بھی تو ضرور دینا تھا۔ جوان بیٹی کو ایسے سوال سے روکا بھی تو نہیں جا سکتا تھا۔

"میری بات اور ہے مدھو۔ ہر ایک نسل پہلی نسل سے الگ ہی طریقہ اختیار کرتی ہے۔ کبھی سوئمبر کا زمانہ تھا۔ کبھی ماں باپ اپنی بیٹیوں کا منہ لپیٹ کر بیگانے گھر بھیج دیا کرتے تھے۔ وقت وقت کی بات ہے میری مدھو کو تو اتنی مرضی کرنے کا حق ہے۔" راجکماری نے یہ بات کہی تو اس کے دل میں ایک اُبال اُٹھا۔

مدھو کا پتا ایک اچھا انسان تھا۔ ایک اچھا شوہر تھا۔ راجکماری نے اُسے اپنا پیار دیا تھا۔ اپنی وفاداری تھی۔ اُس کی ایک اچھی بیوی بن کر رہی تھی۔ لیکن اُس وقت راجکماری کے دل میں اُبھرے ہوئے خیالات کے آگے ایک دُھندلی اور ہلکی ہلکی جھلک پیدا ہوئی۔ وہ جھلک ڈاکٹر دیو کی تھی۔ راجکماری نے کبھی ڈاکٹر دیو کو شوہر کی صورت میں نہیں دیکھا تھا۔ راجکماری نے ایک جھرجھری لی۔ اور ڈاکٹر دیو کی دھندلی سی تصویر راجکماری کی آنکھوں سے ہٹ گئی۔ بے خیالی میں راجکماری نے ایک سرد آہ بھری۔ ڈاکٹر دیو سدا کی طرح ایک ہمدرد ستارے کی طرح راجکماری کی آنکھوں کے آگے بیٹھ گیا۔

راجکماری کو ہوش آیا تو اُس نے دیکھا مدھو کی نظر میز پر پڑی ہوئی منو کی تصویر پر جمی ہوئی تھی۔ اتنی دانشمند ماں کو اور کچھ بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ایسی دانشمند ماں تو بیٹی کے دل کی دھڑکن کو بھی پہچان لیتی ہے۔

"منو اچھا ہے نا" ماں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"مجھے کیا خبر" مدھو کے دل میں وہ ازلی حیا پیدا ہوئی ——— مدھو نے اپنا چہرہ ماں کے کندھے پر رکھ دیا۔

۱۹۴۷ء کا سال شروع ہُوا۔ ہند کی تاریخ میں سدا یاد رہنے والا سال ہندو مسلم فسادات کی آگ خوب بھڑک چکی تھی۔ کسی شہر کے ہاتھ جُھلس گئے تھے۔ اور کسی شہر کے پاؤں جل گئے تھے۔

آگ کے شعلے اور بلند ہوئے۔ دیہات اور شہروں کے جُھلسے ہوئے چہرے پہچانے نہیں جاتے تھے۔ انسان کا لہو پانی کی طرح بہتا رہا۔ دھرتی کے اُوپر خون کی تہیں جم گئیں۔ فرشتوں کے چہرے خون میں ڈوب گئے۔

اُس سال ہندوستان کی دھرتی بٹ گئی۔ سانجھ ٹوٹ گئی۔ ٹوٹے ہوئے رشتوں کے کناروں پر پہرے بٹھا دیئے گئے۔ کوئی کسی کے

حصے میں آئی ہوئی دھرتی پر قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ فوجوں نے بندوقیں تان لیں۔

کسی فریق نے زیادتی کی۔ کسی فریق پر ظلم ہوا۔ نوجوانوں کے خون میں انتقام کا اُبال آیا۔ یہ انتقام ملک کی خدمت محسوس ہونے لگا۔ اُنہی دنوں کی بات ہے۔

مرلا کھڑکی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ مرجھایا ہُوا تھا۔ تھوڑی دیر کے وقفہ کے بعد کھڑکی سے باہر دیکھ لیتی تھی۔ اتنے میں اُس نے کھڑکی سے دیکھا کہ دیو آرہا تھا۔

"بھابی۔ تم نے ایسے وقت میں مجھے بلوا بھیجا۔ کیوں خیر تو ہے؟"

"تمہیں نہ جانے کب سے سندیسہ بھیج رکھا ہے۔ اب آئے ہو۔"

"بھابی۔ ایک مریض ہی ایسا تھا۔ اُسے چھوڑ کر نہیں آسکتا تھا۔ کیس کے خراب ہو جانے کا اندیشہ تھا۔"

"اچھا اچھا۔ کیس کی بات چھوڑو۔ میری بات سنو۔"

"بھابی۔ تمہارے چہرے پر اتنی گھبراہٹ کیوں ہے۔ کرشن کہاں ہے۔؟"

"ٹیلیفون کرنے گئے ہیں۔ میری بات سنو۔ منو آج کل ہسپتال میں بہت کام کرتا ہے۔"

"منو۔ کیوں کیا بات ہے۔ ہسپتال میں روز جاتا تو ہے مگر میں نے اُسے کبھی اتنا وقت دینے کے لئے نہیں کہا۔ مجھے معلوم ہے اُسے امتحان کی تیاری کرنی ہے۔ ہسپتال میں معلومات اس کی امداد کر سکتی ہیں مگر..."

"وہ تو رات کو کرفیو نافذ ہونے کے وقت گھر آتا ہے۔"

"ہسپتال سے تو وہ جلد آجاتا ہے۔ مجھے خبر نہیں۔ بھابی تم نے پہلے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔"

"بات'۔۔ میں نے کبھی اتنا غور نہیں کیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہیں پڑھتا رہتا ہوگا۔ یا ہسپتال میں کام کرتا رہتا ہوگا۔ مگر آج۔۔۔۔"

"کہاں ہے منو۔"

"گھر پر نہیں ہے۔ کہہ رہا تھا آج رات کو کسی دوست کے گھر رہے گا۔"

اس کے جانے کے بعد میں اُس کا کمرہ صاف کرنے لگی۔ چیزیں اِدھر اُدھر رکھ رہی تھی۔ ایک کاغذ اُس کی کتاب میں سے گر پڑا۔ میں اُٹھا کر دیکھنے لگی کہ وہ کاغذ کام کا ہے یا نہیں۔ بہت عجیب سی لکھائی تھی۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میں کچھ کچھ انگریزی بھی پڑھ لیتی ہوں۔ یہ دیکھو نا۔"

سرلا نے ایک کاغذ دیو کے آگے بڑھا دیا۔ دیو نے دیکھا۔ کاغذ پر لکھا تھا۔

"لال کوچہ۔ آج۔ سب ٹھیک ہے۔"

"لال کوچہ تو خالص مسلمانوں کا محلہ ہے۔ میرا دل دھڑک رہا ہے۔ آج کل دن بھی تو بہت بُرے ہیں۔ آدمی آدمی کو دیکھ نہیں سکتا۔ ایسی آگ لگی ہوئی ہے۔ منو شاید اُس محلے میں کسی دوست کے گھر چلا گیا ہے کیا خبر کسی مسلمان دوست کے گھر گیا ہو۔ وہ باز بھی تو نہیں آسکتا۔ آج کل دوستی کی چادر میں دشمنی چھپی ہوئی ہے۔" سرلا کا منہ روہانسا ہوگیا۔

"ٹھہرو بھابی مجھے سوچنے دو۔ کرشن کہاں فون کرنے گیا ہے۔؟"

"وہ تو رمیش کو فون کرنے گئے ہیں۔ میں اِن سے کہتی رہی ہوں کہ منو وہاں نہیں گیا۔ پتہ نہیں منو۔۔۔۔۔" سرلا کہتے کہتے رُک گئی۔ اس کا گلا بھر آیا تھا۔ "جوان ہو کر بیٹے اور بیٹیاں اپنے والدین سے بدلہ لیتے ہیں اپنی من

مانی جو کرتے ہیں۔ نہ کسی کو کچھ بتانا نہ کسی سے کچھ سننا۔ یہ میری پارٹی ہے۔ یہ میرے دوست ہیں۔ ایسے فسادات کے دنوں میں کوئی بھلا گھر سے نکلتا ہے۔ کبھی اندھیرا ہونے پر گھر آتا ہے۔ کبھی آدھی رات کو سینما چلا جاتا ہے۔ کرفیو کا وقت بھی گذر چکا ہے اور منو کا کچھ پتہ نہیں۔ ماں باپ ہر وقت سُولی پر چڑھے رہتے ہیں۔"

"اچھا بھابی میں جاتا ہوں۔ میں جا کر منو کا پتہ چلاتا ہوں۔" دیو نے وہ کاغذ جیب میں ڈال لیا۔

"دیو جی۔ تم کہاں جاؤ گے۔ تھوڑی دیر میں کرفیو لگ جائے گا۔ واپس کیسے آؤ گے۔؟"

"دیکھا جائے گا۔" دیو چلنے لگا۔

"میری قسم لال کوچے نہ جانا۔ یہ وقت اُدھر جانے کا نہیں۔" سرلا نے کہا اور دیو کا کوٹ پکڑ لیا۔

"بھابی۔" دیو نے التجا کرتے ہوئے کہا۔ سرلا نے کوٹ چھوڑ دیا۔ اور دیو چلا گیا۔

چاروں سُو اندھیرا چھا گیا تھا۔ آج کل شہر میں شام ویسے بھی سنسان اور ویران ہوتی تھی۔ کرفیو کا وقت ہونے والا تھا۔ رہے سہے لوگ بھی بسوں میں سوار ہونے کے لئے دوڑ رہے تھے۔ اپنی موٹر چلاتے ہوئے ڈاکٹر دیو نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کرفیو کا پاس دیکھا۔ پاس جیب میں ہی تھا۔ ڈاکٹر دیو موٹر چلاتا گیا۔ اگلے چوک میں سپاہی کا ہاتھ دوسری طرف تھا۔ ڈاکٹر دیو کو موٹر روکنی پڑی۔ ساتھ کی ایک رُکی ہوئی موٹر سے آواز آئی۔

"ہیلو۔ ہیلو۔ ڈاکٹر دیو"

دیو نے دیکھا۔ ساتھ کی موٹر میں اُس کا ایک پرانا مریض تھا۔ دوست نہیں تھا۔ لیکن اُسے جانتا تھا۔

"کیوں کیا بات ہے۔؟"

"اس وقت کہاں جارہے ہو؟"

"اُدھر ایک مریض کو دیکھنے جارہا ہوں"

"اُدھر کدھر؟ لال کوچے کی طرف؟ ڈاکٹر صاحب آج اُدھر نہ جانا۔ خدا کے لئے اُدھر نہ جانا۔" اس شخص نے ذرا گھبرا کر کہا۔ ڈاکٹر دیو مسکرا دیا۔

"نہیں ڈاکٹر میں سچ کہتا ہوں۔ آج اُدھر خطرہ ہے" اُس نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ سپاہی نے ہاتھ دے دیا۔ دونوں موٹریں اپنے اپنے راستہ پر ہولیں۔ لال کوچے کے محلے کے سامنے ان دنوں پہرہ لگا رہتا تھا کہ کوئی ہندو محلے میں داخل نہ ہو سکے۔ ڈاکٹر دیو نے انہیں بتایا کہ اُسے ایک مریض کو ضروری دیکھنا تھا۔ ڈاکٹر دیو محلے میں داخل ہو گیا۔ ایک مکان کے آگے جا رُکا۔

"بشیر احمد" ڈاکٹر دیو نے دروازہ کھٹکھٹایا —— دروازہ کُھلا

"ڈاکٹر صاحب تم —؟" بشیر احمد حیران رہ گیا۔

"ہاں" اور ڈاکٹر دیو اس کے ہمراہ اندر چلا گیا۔

"مریض کا کیا حال ہے۔؟"

"کوئی خاص بات تو نہیں۔ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو رہا ہے — ابھی چارپائی سے اُٹھ نہیں سکتا۔" بشیر احمد نے اپنے بیٹے کی حالت سے آگاہ کیا۔

"آج تم حیران ہو رہے ہو گے کہ تم نے مجھے آج بلایا نہیں تھا۔ اس لئے کیسے چلا آیا۔ میں یہاں نزدیک ہی ایک مریض کو دیکھنے آیا تھا۔ شاید آپریشن کرنا پڑے گا۔ سامان تیار نہیں تھا۔ دو گھنٹوں کی دیر ہے۔ میں واپس نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے سوچا چلو اپنے مریض کا حال پوچھ آؤں شکریہ۔"
بشیر احمد نے ہنستے ہوئے کہا۔ مگر اس کی ہنسی میں پورا اعتماد نہیں تھا۔

ڈاکٹر دیو سمجھتا تھا۔ لیکن وہ بیٹھا رہا۔ مریض کا حال پوچھتا رہا۔

اتنے میں چار ہٹے کٹے مسلمان بشیر احمد کے گھر آ گئے۔

"ڈاکٹر صاحب آج کیا بات ہے۔ اچانک آپ نے یہ مہربانی کیوں کی۔؟" ایک شخص نے پوچھ لیا

"مہربانی نہیں کی۔ یہ میرا فرض ہے۔" ڈاکٹر نے اطمینان سے جواب دیا۔

"مریض کا شکار۔" چار جوانوں میں سے ایک جوان نے کہا۔ اس کی ہنسی میں غصہ شامل تھا۔ ڈاکٹر دیو سے کوئی بات چھپی ہوئی نہیں تھی۔

"ڈاکٹر شکار نہیں کھیلا کرتے۔"

"اس وقت تم ڈاکٹر نہیں ہو۔ یہ مریض نہیں ہے۔ تم ہندو۔ یہ مسلمان ہے۔"

"ڈاکٹر ہمیشہ ڈاکٹر رہتا ہے۔ چاہے مریض ہندو ہو یا مسلمان۔"

"یہ پرانے وقتوں کی بات ہے ڈاکٹر صاحب۔ ہمیں تم پر شک ہے۔"

"اس شک کا کیا سبب ہے۔؟"

"کیونکہ ہندو سدا ہندو نہیں۔ مسلمان سدا مسلمان نہیں؟"

اگر یہ بات ہے تو میں یہ کہہ سکتا ہوں۔ انسان سدا انسان ہے۔

" ہو گا۔ مگر ہم آپ کی تلاشی لینا چاہتے ہیں " آخر کار چاروں نوجوان بول اُٹھے

" معاف کرنا ڈاکٹر صاحب ۔ میں تمہارے احسان کا بدلہ نہیں دے سکتا۔ تم نے میرے بچے کے بھیانک روگ کو دُور کر دیا ہے۔ لیکن زمانے کی ہوا اس احسان سے بھی زبردست ہے " بشیر احمد نے کچھ شرمندہ ہو کر کہا۔

" میں تلاشی دے سکتا ہوں ۔ اگر میرے قبضہ سے کوئی قابلِ اعتراض چیز برآمد نہ ہوئی۔ تو اس کا کیا صلہ دو گے ؟"

" ہم آپ کو اس محلے سے صحیح و سلامت گذر جانے دیں گے۔ ہم خدا کی قسم کھا کر یہ کہتے ہیں "

ڈاکٹر دیو ہنس پڑا ۔ کوٹ اُتار کر رکھ دیا۔ صرف قمیض اور پینٹ میں سامنے کھڑا ہو گیا۔

" آج ایک افواہ ہے کہ ہمارے محلے پر حملہ ہو گا۔ ہم بھی چوڑیاں پہن کر نہیں بیٹھے ہیں " کوٹ کو ٹٹولتے ہوئے ایک شخص نے کہا۔

سارا محلہ تو نہ جانے کیسا تھا۔ لیکن اس گھر کے لوگ بڑے شائستہ تھے ۔ بول چال کا معیار بھی پست نہیں تھا۔ ڈاکٹر دیو کو ابھی تک وہ اپنی پرانی عادت کے مطابق "جی" کہہ کر بُلاتے تھے ۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ ڈاکٹر دیو کے قبضہ سے کوئی قابل اعتراض چیز برآمد نہیں ہوئی تھی۔ بٹوہ میں کوئی ۲۵/ روپے تھے۔ ایک چابی تھی۔ کرفیو کا پاس تھا اور ایک ٹیسٹ ٹیوب۔ ڈاکٹر کی دوا والے بکس پر انہوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ شاید اُس میں کسی قسم کی گیس یا زہریلی چیز نہ ہو۔ اب وہ مطمئن تھے۔

"اس وقت تم ہماری مٹھی میں ہو۔ تمہاری زندگی ہمارے رحم و کرم پر ہے۔" ایک دوا شخص نے ہنستے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر دیو بھی ہنس پڑا۔

"جانتے ہو۔ ہم نے کیا حلف اٹھا رکھا ہے؟ ہاتھ آئے ہوئے ہندو کو مار دینا......"

"لیکن آج ہم یہ بات نہیں ہونے دیں گے۔" وہ سب کبھی نہ کبھی ڈاکٹر کے مریض رہ چکے تھے۔

"اب اگر آپ جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں۔ گلی کے موڑ تک چھوڑ آنا ہمارا کام ہے۔"

"بہت بہت شکریہ۔ مگر تم کہہ رہے ہو کہ حملہ کا ڈر ہے۔ تو میں یہاں رہ کر تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔" ڈاکٹر دیو یوں ہی بیٹھا رہا۔

"ہماری مدد؟ ہماری مدد کے لئے بہت کچھ ہے۔ کیا دیکھنا چاہتے ہو؟ آؤ۔" دو آدمی ڈاکٹر کو کسی جگہ لے جانا چاہتے تھے۔ مگر ڈاکٹر نہیں اٹھا۔

انہوں نے کئی قسم کے ہتھیار گنوا کر بتلائے۔ گیس، گولیوں، چھریوں اور چاقوؤں کے بہت سے نام گنوا دیئے۔ اور پھر بولے۔ "ان کے ہوتے ہمیں ایک نہتے آدمی کی امداد کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے۔"

"لیکن یہ چیزیں بھی مدد دینے والی چیزیں نہیں۔" ڈاکٹر دیو بولا۔

"ہم حملہ آوروں کو کاٹ کر رکھ دیں گے۔"

ڈاکٹر نے یہ سنا تو اس کے دل میں ایک ٹیس اٹھی مگر وہ خاموش رہا۔ تھوڑی سی دیر تک رک کر بولا۔

"تمہارے پاس گیس ہے۔ تمہارے پاس بارود ہے۔ چھرے ہیں۔

پستولیں ہیں۔ یہ سب کچھ زخم لگانے والی چیزیں ہیں تمہارے پاس مرہم نہیں ہے۔"

"ڈاکٹر کیا تو ایک ہندو ہو کر مسلمانوں کے زخموں پر مرہم لگا سکے گا۔؟"

بات کہنے والے شخص نے "تم" کی بجائے "تو" کا لفظ استعمال کیا۔ شاید اُسے ڈاکٹر کی مرہم لگانے والی بات مذاق معلوم ہوئی تھی۔

"ڈاکٹر کا کام یہی ہے کہ وہ ہمیشہ زخموں پر مرہم لگائے۔"

"اپنے بھائیوں کو زخم لگانے سے روکنا کیا تیرا کام نہیں۔" ایک شخص نے بزرگوں جیسے انداز میں کہا۔

"بس چلے تو یہ بھی ہو سکتا ہے۔۔۔۔" ڈاکٹر بولا۔

گلی میں گولہ پھٹنے کی بھیانک آواز پیدا ہوئی۔ سب کے منہ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ زردی چھا گئی اور اس کے بعد خون کی سُرخی چمک اُٹھی۔

"خبردار" حملہ آوروں کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستولوں کے سامنے دلی کا ہر دلعزیز ڈاکٹر دیو شیر کی طرح دہاڑ اٹھا۔

"چاچا جی۔" حملہ آواروں میں سے ایک شخص کی آواز آئی۔

اتنے میں ایک منچلے نوجوان نے ایک اینٹ حملہ آوروں کے اُوپر پھینکی جو کسی کے کندھے پر لگی اور حملہ آور پھر جوش میں آ گئے۔

ڈاکٹر دیو اُن کے قدموں میں لیٹ گیا۔ "مجھے قدموں تلے روندے بغیر تم کسی پر وار نہیں کر سکتے۔" ڈاکٹر دیو کے ان الفاظ نے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے پستولوں کو ناکارہ کر دیا۔

محلے کے مسلمانوں پر ان الفاظ نے نہ جانے کیا اثر کیا کہ وہ اینٹ پھینکنے

والے ساتھی کو ڈاکٹر دیو کے سامنے لے آئے۔ "آج آپ امن کے محافظ ہیں۔ یہ آپ کا مجرم ہے" مسلمانوں نے آگے بڑھ کر اپنے ساتھی کا ہاتھ ڈاکٹر دیو کے ہاتھ میں دے دیا۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کی دونوں جماعتیں ڈاکٹر دیو کے دائیں بائیں موجود تھیں۔ مگر ڈاکٹر دیو کو ایک طرف ہٹا کر الگ کر دینے کی جرأت دونوں میں نہیں تھی۔

"تم قصوروار ہو" ڈاکٹر دیو نے کہا۔ قصوروار نے اپنا سر جھکا لیا۔

"تمہیں اس کی سزا ملے گی" ڈاکٹر دیو بولا۔ قصوروار خاموش رہا لیکن اس کے ساتھیوں نے ڈاکٹر دیو کی ہاں میں ہاں ملائی۔ آج ڈاکٹر دیو نے سب کی جان بچالی تھی۔

"اس محلے کا سارا اسلحہ لے جا کر پولیس کے سپرد کرنا ہوگا۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو پولیس خود آکر اسلحہ پر قبضہ کرے گی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بہت سی گرفتاریاں ہوں گی" ڈاکٹر دیو نے کہا۔

سب نے یہ بات منظور کر لی۔ ان دنوں سرکار کا یہ حکم تھا کہ کسی قسم کا اسلحہ اپنے قبضہ میں رکھنا جرم ہے۔ اور اسلحہ خود بخود پولیس کے حوالے کر دینے پر کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔

حملہ کرنے والے آئے اور واپس چلے گئے۔ ہتھیار ہاتھوں میں تھامے گئے لیکن وہ ہاتھوں میں ہی رہے۔

بہت سی جانیں جو موت کے منہ میں جانے والی تھیں۔ دوبارہ زندگی سے ہمکنار ہوگئیں۔

ڈاکٹر دیو اپنی موٹر میں بیٹھ کر واپس چلا گیا۔ کرفیو بدستور نافذ رہا۔

صبح سویرے کرفیو کے اُٹھنے پر جب منو گھر آیا تو اس کے چہرے کا رنگ یوں نظر آ رہا تھا۔ جیسے برسوں کا بیمار ہو۔

اُس کی ماں بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ اُسے دیکھ کر اور بھی گھبرا گئی کرشن لال رات بھر اچھی طرح سو نہیں سکا تھا۔ ابھی اُس کی آنکھ لگی تھی۔

منو آتے ہی چارپائی پر لیٹ گیا۔ اُسے اپنے سارے عقائد، نظریات، اپنے اتنے دنوں کے دوست، اپنی پارٹی بہت ہلکے اور کھوکھلے محسوس ہو رہے تھے۔ دلو چچا کا چہرہ ان سب پر چھا گیا تھا۔ اُسے "دھرم رکھشک سمیلن" میں شامل ہوئے بہت دن ہو چکے تھے۔ اُس نے اپنی پارٹی کا نام اور اپنے کام سب سے چھپا رکھے تھے۔ اپنے چچا دلو سے بھی چونکہ اس کی پارٹی کا کچھ ایسا ہی اصول تھا۔ منو چارپائی سے اُٹھ بیٹھا۔ کرسی پر

بیٹھ گیا۔ میز پر جھکا رہا۔ بازوؤں کی کہنیوں پر اس کا سوچ میں ڈوبا ہُوا سر رکھا تھا۔

سرلا اپنے بیٹے کے جوان کندھوں پر جھک گئی۔ وہ سرتاپا محبت بن گئی۔ اس نے یہ پوچھا ہی نہیں کہ وہ رات بھر کہاں رہا تھا۔

"منو۔"

"جی ماتا جی۔؟"

"اتنی اداسی۔۔۔۔۔۔"

"نہیں ماں۔ تھک گیا ہوں۔ اداس تو نہیں ہوں۔" منو کبھی اپنی ماں کو "ماتا جی" اور کبھی پیار سے صرف "ماں" کہہ کر بلایا کرتا تھا۔

منو سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اُس کی ظاہری ہنسی ماں کا دل نہ بہلا سکی۔

"ماں میں ذرا چچا جی کے پاس ہو آؤں۔ مجھے ایک کام ہے اگر چائے پیوں گا۔"

"دیو نہ جانے کہاں کہاں بھٹک رہا ہوگا۔ رات کو تجھے ڈھونڈنے گیا تھا۔" سرلا نے افسردہ لہجہ میں کہا۔

"مجھے ڈھونڈنے؟" منو چونک پڑا۔

"میں نے ہی تو اُسے بلایا تھا اور کہا تھا۔۔۔۔"

"کیا کہا تھا؟" منو بیٹھا بیٹھا اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"تیری میز پر مجھے ایک کاغذ ملا تھا۔ جس پر لال کوچہ لکھا ہُوا تھا۔ میں گھبرا گئی کہ وہ محلہ تو مسلمانوں کا ہے۔ وہ نہ جانے تجھے کہاں کہاں ڈھونڈتا رہے گا۔ تو شاید رات کو رمیش کے یہاں رہا ہوگا۔۔۔۔" ماں نے متفرانہ

نگاہوں سے منو کی طرف دیکھا۔

منو ماں کی طرف نہ دیکھ سکا۔ اُس کی پھٹی پھٹی آنکھیں سامنے دیوار پر لگی ہوئی تھیں۔

"مجھے قدموں تلے روندے بغیر تم وار نہیں کر سکتے۔" ڈاکٹر دیو کے رات والے الفاظ منو کے کانوں میں گونج اُٹھے۔ ڈاکٹر دیو نے تجھے بچانے کے لئے اپنے آپ کو بھیانک خطرہ میں ڈال دیا تھا۔ منو کے دل سے آواز اُٹھ کر اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

"ماں" منو ماں کے سینے سے لگ گیا۔ "چاچا جی انسان نہیں دیوتا ہیں۔" منو کے منہ سے نکلا۔

آج منو جب ڈاکٹر دیو کے کمرے میں آیا تو ڈاکٹر دیو چارپائی پر لیٹا ہُوا تھا۔ اُس نے آج تک ڈاکٹر دیو کو دھوپ میں یوں لیٹا ہُوا نہیں دیکھا تھا۔ اُسے فکر ہوئی کہ ڈاکٹر دیو بیمار نہ ہو۔

"چاچا جی۔"

"آؤ منو......"

"آپ اس وقت یوں......"

"کچھ نہیں منو۔"

"چاچا جی۔"

"آج جینے کی ہمت ڈانواں ڈول ہو رہی ہے۔" ڈاکٹر دیو کی آنکھوں

سے آنسو ٹپکے نہیں تھے۔ مگر آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

"چاچاجی"۔ منو اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔

"آج کا اخبار پڑھا ہے۔

"ہاں"۔

" اور اس ٹرین کا حال بھی۔؟"

"ہاں۔ انسانوں سے بھری ہوئی ریل گاڑی ساری کی ساری کاٹ دی گئی"۔

"انسان بہت پستی میں گر گیا ہے۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا . . . مذہب ایک جنون ہے۔ جو انسان کو پاگل بنا دیتا ہے۔ انسان حیوان ہو گئے مویشی بن گئے۔ تہذیب، بیسویں صدی، سائنس کی لاشیں آج بازار میں خوار ہو رہی ہیں"۔ ڈاکٹر دیو چارپائی پر اُٹھ کے بیٹھ گیا۔

"چاچاجی"۔ منو نے بڑے دُکھ سے کہا۔

" عورتوں کی حالت"۔ دیو کا رواں رواں کانپ اُٹھا۔

" بیسویں صدی کے چہرے پر لعنت برس رہی۔ تاریخ کے اوراق ہندوستان کے اس حادثہ پر ہمیشہ نادم رہیں گے۔ . . . یہ آنسو ان داغوں کو دھو نہیں سکیں گے۔ یہ داغ جو انسان نے انسان کے خون سے زمانہ کی چادر پر لگائے ہیں۔ دیو کا غم الفاظ سے مکمل طور پر ادا نہیں ہو رہا تھا۔

جن صدیوں کی پیغمبروں نے پرورش کی۔ اُن صدیوں کی بیٹیوں کو، ان صدیوں کی بہنوں کو، ان صدیوں کی ماؤں کو مذہب نے گلی کوچوں میں ذلیل و خوار کیا۔

" چاچاجی۔ ہسپتال میں زخمیوں کے بعد زخمی آرہے ہیں۔ سرکار نے مطلع کیا ہے کہ ان زخمیوں کو ہسپتال میں زیادہ سے زیادہ داخل کرو۔"

" منو۔ میں اِن زخمیوں کے سامنے کیسے جاؤں؟ میرا چہرہ بھی تو اس انسان کی طرح ہے۔ جس نے ان کے سینوں میں چھُرے گھونپے۔ جس نے ان کی ٹانگوں میں بندوقوں کی گولیاں بھر دیں۔ جس نے ان کی آنکھوں میں چاقو جھونک دیئے۔ اُن کے سامنے جاؤں! وہ کیا کہیں گے۔ آج انسان ہماری

مرہم پٹی کرنے آگیا۔ کیا اسے شرم نہیں آتی؟ اُس وقت اس کا مرہم کہاں تھا جب اس نے راہ چلتے پیٹھ میں چھُرا گھونپا تھا۔ میں کیا منہ لے کر ان کے سامنے جاؤں۔؟ قاتل کا چہرہ بھی مجھ جیسا ہوگا۔ اُس کے بھی دو آنکھیں۔ ناک۔۔۔۔۔ کان۔۔۔۔۔"

"کاش چاچا جی دُنیا آپ کی طرح ہوتی۔" منو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"منو۔ نفرت کے داغ نفرت کے پانی سے نہیں دھوئے جاتے۔" ڈاکٹر۔ دیو نے کہا۔ اس کے سانس میں سرد آہ ملی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر دیو سونے لگا۔ وہ بستر پر دراز ہو چکا تھا۔ اس کی کتاب کے بمشکل دو صفحے باقی تھے

"چاچا جی۔ چاچا جی۔" منو نے آکر دروازہ کھٹکھٹایا۔ منو کی آواز سن کر ڈاکٹر دیو اُٹھ بیٹھا۔ دروازہ کھولا اور اُسے اپنے پاس بٹھالیا۔

"چاچا جی۔ آپ کی اور میری عمر کا فرق چاہے باپ بیٹے جتنا ہے۔ مگر میں ہمیشہ آپ میں دوستوں جیسا تپاک ڈھونڈتا رہا ہوں۔" منو نہ جانے اس سے آگے کیا کہہ رہا تھا۔ اس کی آواز میں بڑی گھبراہٹ تھی۔

ڈاکٹر دیو سنجیدگی سے مسکرا دیا۔

"آج میں نے ایک بات سنی ہے معلوم نہیں غلط ہے یا صحیح۔ لیکن میں وہ بات اپنے پتا سے نہیں کہہ سکتا۔ آپ سے کہہ سکتا ہوں۔" منو

بچوں کی طرح دیو کے گلے سے لپٹ گیا۔ چچا دیو اُس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ پیار کرتا رہا۔

"چاچاجی۔ میری طرف دیکھو۔ مجھے سچ سچ بتاؤ۔ مجھے معلوم ہے اگر اس میں ایک بات بھی سچی ہوئی تو آپ کو ضرور اس کا علم ہوگا۔ آپ پتاجی کے بہت نزدیک ہیں۔ آج مجھے کسی نے بتایا ہے کہ میں پتاجی کے گھر پیدا نہیں ہُوا تھا۔ پتاجی نے مجھے کہیں سے لاکر پالا ہے۔ کیا یہ سچ ہے۔" منو نے پوچھا۔

ڈاکٹر دیو کے ماتھے پر جاڑے کی سرد رات کو بھی پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ منو اور بھی گھبرا گیا۔

"چاچاجی۔ آپ بولتے کیوں نہیں ہیں؟ میں ایک نادان بچہ نہیں ہوں۔ مجھ پر کوئی بُرا اثر نہیں ہوگا۔ آپ نے تو مجھے بہت فراخدل بنا دیا ہے۔ میں سب کچھ سن سکتا ہوں۔ سمجھ سکتا ہوں۔"

"منو اگر یہ بات سچی بھی ہو تو کیا تیرے پتا تیرے پتا نہیں ہوں گے۔ تیری ماں۔ تجھ سے پیار کرنے والی ماں تیری ماں نہیں رہے گی۔؟ دیو منو کی پیٹھ پر پیار کرتا رہا۔

"نہیں چاچاجی۔ وہ سدا میرے پتا رہیں گے۔ وہ ہمیشہ میری ماں رہے گی۔ میں ہمیشہ اُن کا بیٹا رہوں گا۔ اس بات پر کوئی فرق نہیں پڑے گا..... صرف....."

"صرف کیا۔؟"

"یہ بات اگر سوم ناتھ جی کے گھر تک پہنچ گئی۔ تو شاید اس کا بُرا اثر پڑے۔ اور پھر مدھو..... تمام کھیل بگڑ جائے گا۔" منو کی اس بات

پر دیو کو پتہ چلا کہ معاملہ بڑی حد تک بگڑ چکا تھا۔

"چاچا جی۔ کیا آپ اُپندر کو جانتے ہیں۔ مدھو کے کالج میں پڑھتا ہے کبھی کبھی مدھو کے گھر بھی آتا ہے۔"

"مجھے شروع سے وہ بُرے دل کا انسان نظر آتا رہا ہے۔"

"اُس نے صرف میرے ماتا پتا کو ہی تکلیف دینے کے لئے یہ بات تلاش نہیں کی وہ مجھے سوم ناتھ جی کی نظروں میں بھی گرانا چاہتا ہے۔ وہ مجھے مدھو کی آنکھوں میں کچھ بنانا چاہتا ہے۔ ایک دن کی بات ہے چاچا جی.... مدھو کی ایک سہیلی ہے رنجو۔ اُپندر اُسے ورغلانا چاہتا تھا۔ رنجو کو اُپندر کے اصل چال چلن کا کچھ علم نہیں تھا۔ وہ اُپندر کی باتوں میں آگئی۔ مدھو نے میری امداد طلب کی۔ اُپندر رنجو کو اپنی موٹر میں بٹھا کر گھر چھوڑنے کے لئے گیا۔ میں مدھو سے کالج میں ملنے گیا ہوا تھا۔ مدھو کو جب اس بات کی خبر ہوئی تو اُسے خطرہ محسوس ہوا۔ میں نے اور مدھو نے اُپندر کا پیچھا کیا۔ مدھو کا خدشہ سچا تھا۔ اُپندر رنجو کو اس کے گھر لے جانے کی بجائے اپنی جان پہچان کے ایک دوست کے گھر لے گیا تھا۔ قصہ کوتاہ۔ رنجو کی زندگی ایک بہت بڑے خطرے سے محفوظ رہی لیکن اُپندر میرا دشمن بن گیا۔ یہ شاید اس دشمنی کا بدلہ لیا جا رہا ہے۔" منو نے اپنے سارے اندیشے بیان کر دیئے۔

"اچھا۔ منو۔ یہ بتاؤ۔ تم اپنے متعلق کیا سوچتے ہو۔؟"

"میں اسی طرح سوچتا ہوں چاچا جی کہ میں آج ویسا ہی ہوں جیسا کل تھا۔"

"اور تیرے ماتا جی۔ تیرے پتا جی۔ تمہیں کیسے لگتے ہیں۔"

"مجھے وہ پہلے سے زیادہ اچھے لگتے ہیں۔ دیوتاؤں کی طرح۔"

"تو پھر دنیا سے کیا ڈرنا۔ اگر تیری اپنی نظر میں کوئی فرق نہیں۔ تو پھر تمام فرق بے معنی ہیں۔ اچھا تو اور اُس نے کیا کہا تھا۔؟"

"اس نے کہا تھا۔ تو ایک کنواری ماں کا بیٹا ہے۔"

"اس بات کا تم پر کیا اثر ہُوا۔؟"

"کوئی اچھا یا بُرا اثر نہیں ہُوا۔ حیرانی ضرور ہوئی ہے۔"

"تمہیں جنم دن دینے والی ماں تمہاری آنکھوں میں کیسی ہے؟"

"مجھے تو اس سے ہمدردی ہے۔"

"وہ اگر تمہیں کبھی مل جائے تو۔؟"

"میں اس سے جی بھر کے پیار کروں گا۔ جو زندگی نے اُسے نہ دیا۔ والدین نے نہ دیا اور جسے سماج نے زبردستی اُس سے چھین لیا۔ میں وہ پیار اُسے لوٹا دوں گا۔"

"میرے بچے۔ مجھے تجھ سے یہی اُمید تھی۔" دیو نے منو کو گلے سے لگا لیا۔

"آپ کا شاگرد ہوتے ہوئے میں آپ کی اُمیدوں سے کم تر ثابت نہیں ہو سکتا چاچا جی۔ آپ نے مجھے زندگی میں بہت کچھ سکھایا ہے۔" منو نے دیو چچا کو اپنی آغوش میں بھینچ لیا اور کافی وقت گذر گیا۔

"تیرے پتا جی خود ہی ایک روز تمہیں سب کچھ بتا دیں گے۔ انہوں نے سوچ رکھا ہے۔ کہ تیری پیدائش کا حال بہت سے لوگوں کو معلوم ہے۔ کئی رشتہ دار اس راز سے آگاہ ہیں۔ یہ بات تیرے کانوں تک ضرور پہنچے گی۔ انہوں نے سوچا تھا۔ جب تیرے کان اس بات کو سُننے اور سمجھنے کے قابل ہوں گے تو وہ خود ہی تجھے صداقت سے آگاہ کر دیں گے۔ تیرا ۲۵ واں

جنم دن کب ہے؟ ہاں یاد آ گیا۔ اگلے مہینے۔ اس رات شاید وہ تمہیں سب کچھ بتا دیں گے۔ وہ کہتے تھے۔ اس کے بعد ان کی قسمت کا فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہوگا کہ تو انہیں اپنے جنم داتا ماں باپ سمجھے گا یا نہیں۔"

"چاچا جی۔ یوں نہ کہو۔ وہ تو صدیوں سے میرے ماں باپ ہیں مجھے اُن پر ناز ہے۔ میں ان کے جگر کا ٹکڑا ہوں۔"

"شاباش۔ میرے بچے۔"

"میں سوچتا ہوں۔ خبر نہیں میرا پتا کون ہے۔؟"

"مجھے خیال آتا ہے کہ میری ماں کو لوگوں سے اور گھر کے افراد سے نہ جانے کیا کچھ سننا پڑا ہوگا۔ لوگ اُس کی توہین کرتے ہوں گے۔ اُس پر لعنت بھیجتے ہوں گے۔" منو کہہ رہا تھا اور ڈاکٹر دیو سُن رہا تھا۔ انسان کی زندگی میں کچھ ایسی گھڑیاں بھی آتی ہیں۔ جب اُسے اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا۔ ساری گرہیں کُھل جاتی ہیں۔ برسوں کا پردہ وہ صبر و تحمل بھی ہمت ہار جاتا ہے۔ ڈاکٹر دیو کے سامنے بھی ایسی گھڑی آ گئی تھی۔

"وہ دیوی تھی۔" ڈاکٹر دیو کے مُنہ سے نکلا۔

"کیا آپ اُسے جانتے ہیں؟ کیا وہ زندہ ہے۔ بولو۔ بولو۔" منو ڈاکٹر دیو کے آگے سراپا التجا بن گیا۔

دیو سوچ نہ سکا کہ وہ کیا کہہ بیٹھا ہے۔ "منو اب اور کچھ نہ پوچھو۔ تمہیں اپنے چچا پر یقین ہے نا؟ زندگی جس راستہ پر جا رہی ہے۔ اُس پر چلنا ہے قدرت نے جو کچھ چھپانا ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ پوشیدہ رہتا ہے۔ اور اُسے جو کچھ دکھانا ہوتا ہے۔ ضرور دکھائی دیتا ہے۔"

"آپ جیسا کہیں۔ وہی ٹھیک ہے۔" منو نے جھجکتے ہوئے کہا۔

منّو اور دیو دونوں دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ باتیں کرنے سے بھی زیادہ وہ خود کو ایک دوسرے کے نزدیک محسوس کر رہے تھے۔

کچھ دیر کے بعد منّو سنبھلا۔ اُسے اب گھر جانا چاہیئے تھا۔ وہ چلا گیا۔

ڈاکٹر دیو کو کمرے میں بجلی کی روشنی بہت بوجھل معلوم ہونے لگی جس کے نیچے اُس سے بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔ وہ پل پل بے نقاب ہوتا جا رہا تھا۔ پھر اُسے یاد آیا کہ منّو مدھو سے پیار کرتا ہے۔ ڈرتا ہے کہ مدھو اُس سے چھین نہ لی جائے۔

ڈاکٹر دیو نے بجلی بجھا دی اور پھیلے ہوئے اندھیرے میں اُس نے بستر میں گھٹنوں پر سر رکھ دیا۔

"میری کہانی عمر بھر ادھوری رہی منّو تیری کہانی پوری ہو۔" ڈاکٹر دیو کے منہ سے نکلا۔ خبر نہیں یہ الفاظ قدرت کی کسی طاقت نے سنے یا نہیں۔

دوپہر کا وقت تھا۔ راجکماری مدھو کے جہیز کی چیزیں ایک ایک کر کے اپنی بنائی ہوئی فہرست سے ملاتی جارہی تھی۔ اور ٹرنک میں رکھتی چلی جارہی تھی۔ جب اُس کی نوکرانی نے اُسے آکر بتایا کہ کوئی لڑکا اُس سے ملنے آیا تھا تو راجکماری نے دوبارہ یہ پچھوا بھیجا کہ وہ کس سے ملنا چاہتا تھا۔ راجکماری نے سوچا یا تو وہ اس کے شوہر کا واقف ہوگا۔ یا مدھو کا کوئی ہم جماعت ہوگا۔ اور مدھو سے ملنے آیا ہوگا۔ مگر نوکرانی نے آکر بتایا کہ وہ لڑکا مدھو کی ماں سے ملنا چاہتا ہے۔ راجکماری نے ہاتھ کا کام چھوڑ دیا اور باہر بیٹھک میں اس لڑکے کو بلوا لیا۔

"ماتا جی — میں نے آپ کو تکلیف دی ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے۔ یہ تکلیف آپ کے بھلے کے لئے ہو" آنے والے لڑکے نے کہا۔

"کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں۔؟"

"مجھے اُپندر کہتے ہیں۔ میں پہلے دو چار مرتبہ آپ کے گھر آچکا ہوں۔

میں مدھو کا ہم جماعت ہوں۔"

"کہیئے کیا بات ہے"۔

"آپ شاید مدھو کی منگنی کر چکے ہیں"۔

"منگنی کی رسم ابھی ادا نہیں ہوئی۔ ویسے شادی کا فیصلہ بھی ہو چکا ہے"۔

"میں مدھو کا بہی خواہ ہوں اور اُسے ہمیشہ سُکھی دیکھنا چاہتا ہوں۔

"کہیئے کیا بات ہے۔؟"

"میری اپنی کوئی غرض نہیں۔صرف مدھو کا سُکھ ......"

"آپ جو کہنا چاہیں کہہ سکتے ہیں۔میں آپ پر کوئی شک نہیں کر رہی ہوں۔؟"

"ایک باعزت گھرانے میں ایک آوارہ اور حرامی لڑکے کی آمد میں برداشت نہیں کر سکتا"۔ اُپندر کے دل میں جوش کی بجائے غصہ زیادہ اُبل رہا تھا۔

"میں نے بڑے سکون سے آپ کی بات سُنی ہے۔آپ کو اتنے سخت الفاظ استعمال نہیں کرنے چاہیئے تھے۔

"میں سچائی کو جانتا ہوں۔آپ حقیقت سے ابھی ناواقف ہیں"۔

"کوئی ثبوت؟"

"منو سیٹھ کرشن لال جی کا اپنا بیٹا نہیں۔انہوں نے صرف اس کی پرورش کی ہے"۔اُپندر نے سارا راز کھول دیا۔اور پھر ایک بہادر اور فتحمند سپاہی کی طرح راجکماری کی طرف دیکھنے لگا۔

"اگر آپ کی بات مان بھی لی جائے۔تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔انہوں نے اُسے روزِ پیدائش سے پالا ہے۔وہ انہی کا بیٹا کہلا سکتا ہے"۔راجکماری

نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"اگر کسی بے سہارا اور غریب بچے کو پالا ہوتا اور بات تھی۔ لیکن وہ تو ایک کنواری ماں کا بیٹا تھا۔ اُس کی ماں ابھی تک زندہ ہے۔ اُس کا باپ ابھی تک زندہ ہے۔ مجھے اس کی ماں کا پتہ تو نہیں چل سکا۔ مگر میں یہ بتا سکتا ہوں۔ کہ اُس کا باپ کون ہے۔" اُپندر نے راجکماری کی طرف ایک اُس دولت مند شخص کی طرح دیکھا۔ جو کسی شخص کو مٹھی بھر کچھ دینے کے بعد اور بھی کچھ دینا چاہتا ہو۔"

"کون ہے وہ۔؟" راجکماری نے پوچھا۔

"ڈاکٹر دیو راج۔"

"ہیں۔" راجکماری کے دل میں نہ جانے کون سی چیز نے سر اُبھارا۔

"ہاں۔ ماتا جی۔ میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ آپ سچائی سے ناواقف ہیں دیو راج اُن دنوں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ جب اس کی محبوبہ کے یہاں یہ بچہ پیدا ہوا۔ ماں باپ نے وہ شادی نہ ہونے دی۔ جو بچہ پیدا ہوا تھا۔ اُسے ایک ہسپتال میں رکھ دیا گیا۔ اپنی بیٹی کی شادی ایک امیر گھرانے میں کر دی دیو راج نے وہ بچہ سب سے چوری ہسپتال سے نکلوا لیا کرشن لال دیو راج کا دوست تھا۔ ان کے یہاں کوئی اولاد نہیں تھی۔ انھوں نے اُس بچے کو پال لیا۔" یہ ساری بات سُنا کر اُپندر نے فاتح فوج کے کمانڈر کی طرح سے فخر سے سر اُٹھایا۔

راجکماری نہ جانے کون سے خیالات میں محو ہو گئی۔ اُپندر پھر بول اُٹھا "آپ کو شاید میری بات پر یقین نہیں آ رہا۔ اس راز کا اس ہسپتال کے ڈاکٹر کو اچھی طرح علم ہے۔ آپ کہیں گی کہ ڈاکٹر کبھی ایسی غیر ذمہ دارانہ بات نہیں کیا کرتے یہ ٹھیک

ہے ۔ لیکن ڈاکٹر اور دیوراج کی گفتگو ایک نرس نے سُن لی تھی ۔ وہ نرس میری ماں کی بیماری کے دوران ہمارے گھر آیا کرتی تھی ۔ میرے چاچا جی کے یہاں کوئی اولاد نہیں تھی ۔ وہ کوئی بچہ گود میں لینا چاہتے تھے ۔ انہی دنوں اس نرس نے اُس بچہ کے بارے میں ہمارے گھر اطلاع دی تھی ۔ چاچا جی کے دل میں شوق پیدا ہُوا کہ وہ بچہ اپنی گود لے لیں ۔ لیکن دوسرے ہی دن نرس کی زبانی ہمیں معلوم ہُوا کہ وہ بچہ کوئی شخص ہسپتال سے لے گیا ہے ۔ میری چاچی جی کو اپنی قسمت پر اس قدر افسوس ہُوا کہ وہ کئی روز تک روتی رہیں ۔ اگرچہ یہ ساری باتیں میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے کی ہیں ۔ لیکن چاچی جی بڑی حسرت سے ہمیں بتاتی رہیں ۔ کہ اس وقت انہیں یہ محسوس ہُوا تھا ۔ جیسے کسی نے اُن کا بچہ چھین لیا ہو ۔ اُس نرس سے مجھے پتہ چلا تھا کہ بچہ کو اس کا حقیقی باپ ہی لے گیا تھا ۔"

راجکماری نے سر جھکائے رکھا ۔ اُپندر دل ہی دل میں بہت خوش نمستے کر کے وہاں سے چلا گیا ۔

اُپندر تو چلا گیا ۔ مگر راجکماری صوفے پر سے اُٹھ کر دیو کی تصویر کے سامنے جا کھڑی ہوئی ۔ راجکماری کی چڑھتی جوانی پھر سے اُس کے چہرے پر نمودار ہو گئی ۔

وہ تصویر کے سامنے کھڑی ہو کر ہنس پڑی ۔

" دیو تم ہمیشہ کی طرح مسکرا رہے ہو ۔ تم ہمیشہ مجھ سے چھپتے رہے ہو ۔ لیکن آج میں نے تمہیں پا لیا ہے ۔ تم کہا کرتے تھے ۔ تمہارا پیار گم ہو چکا ہے ۔ لیکن تمہارے پیار کی نشانی تمہارے پاس ہے ۔ میں پوچھا کرتی تھی کہ وہ نشانی کیا ہے ۔ ؟

تم ہنس کر جواب دیا کرتے تھے یاد ۔ میں نے آج وہ نشانی دیکھ لی ہے دیو ۔

تم نے میری پرستش پر یقین نہیں کیا تھا...... تم نے مجھے سب کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں نے اپنی پرستش کے زور سے تمہارا سارا بھید جان لیا ہے۔ تمہارا بچہ۔ تمہارا خون۔ تمہارے پیار کا جیتا جاگتا بُت ــــ میری بیٹی کا شوہر بنے گا۔ میں کس قدر خوش نصیب ہوں!"

راجکماری ہنستے ہنستے صوفے پر لیٹ گئی اور پھر اپنے آپ سے باتیں کرتی رہی۔

"تم سچ مچ دیوتا ہو۔ تم نے اپنے پیار کی کس طرح پرورش کی ہے۔ اپنی ساری جوانی صرف کر دی۔ ساری عمر صرف کر دی۔ پیار کی نعش کو سینے سے لگائے رکھا۔ وہ عورت بھی ضرور دیوی ہوگی۔ وہ کس قدر خوش نصیب ہے کہ تم نے اُس سے پیار کیا۔ اتنا پیار کیا جتنا پیار کوئی مرد کر نہیں سکتا۔ آہ وہ بچاری۔ جو تم جیسے عاشق سے جیتے جی بچھڑ گئی۔ اپنے بچے سے جُدا ہو گئی۔ کاش دیوجی! تم مجھے یہ بتا دیتے کہ وہ کہاں ہے۔ میں اس کے قدموں کی دھول اپنے ماتھے سے لگاتی۔ اُس کی پُوجا کرتی۔ اُس کے دُکھی دل کو بتاتی" بہن۔ تو دُنیا کی تمام عورتوں سے خوش نصیب ہے کہ تمہیں ایسا پریمی ملا تیرا پریمی صرف تیرا ہے۔ صرف تیرا۔"

راجکماری سکون اور مسرت کی لہر میں ڈوب گئی۔ اس لہر نے اُسے ڈھانپ لیا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے ہونٹ پھڑپھڑانے لگے۔

"آنے والے تو آیا تھا۔ کہ منو کو میری نظروں میں گرا دے۔ تجھے شاید معلوم نہیں تھا۔ کہ تو منو کو کن بلندیوں پر چڑھا کر چلا گیا ہے۔ میں مدھو کو بتاؤں گی۔ کہ منو ایک سیدھے سادے انسان کا بیٹا نہیں۔ منو ایک دیوتا کا بیٹا ہے تو ساری عمر اُس کی پُوجا کرنا۔ مدھو تو کس قدر خوش نصیب ہے کہ تجھے

دیو جی کا بیٹا مل رہا ہے۔"

راجکماری کے دل میں مسرت کی ایک اور لہر اُٹھی۔ اور اس لہر نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ دروازہ پر دستک ہوئی اور راجکماری سوچنے لگی۔ مسرت میں کوئی اڑچن نہ پیدا ہو جائے۔ پھر وہ ہنس پڑی۔ آج تو ہر ایک اڑچن بھی مسرت انگیز ہوتی جا رہی تھی۔ آنے والا ڈاکٹر دیو تھا۔ اس کے چہرے پر کبھی نظر نہ آنے والی گھبراہٹ تھی۔ رات کی پریشانی اُسے یہاں لے کر آئی تھی۔ وہ راجکماری کا دل ٹٹولنے آیا تھا کہ منو کی خوشی کہیں ادھوری تو نہیں رہے گی۔

اس نے راجکماری کو بہت ہی خوش دیکھا۔ اس کے دل پر ایک ضرب لگی۔ نہ جانے راجکماری حقیقت کو جان کر کیا سوچے گی؟ دیو کو کچھ پوچھنا نہ پڑا۔ کماری نے ہنس کر کہا۔ "شادی میں ابھی ایک مہینہ رہتا ہے نا؟"

یہ سن کر دیو ڈر گیا۔ کماری کہتی رہی۔ "بہت دن ہیں اس سے کیا جلدی نہیں ہو سکتا۔؟

میں چاہتی ہوں کہ منو جلد سے جلد میرا ہو جائے۔ میرا بیٹا بن جائے آپ کا بیٹا میرا بیٹا بن جائے۔" راجکماری نے آنکھیں جھکا لیں۔ ڈاکٹر دیو کے سارے اندیشے دُور ہو گئے۔ اُسے معلوم ہو گیا کہ نہ جانے کیسے راجکماری یہ جان گئی تھی کہ منو ڈاکٹر دیو کا بیٹا تھا۔

زیادہ دن بیچ میں نہ پڑے۔ منو اور مدھو کی شادی شروع ہوئی اور پایہ تکمیل کو پہنچ گئی۔

رشتے جوں کے توں رہے۔ جیسے قدرت نے جوڑے تھے۔ مدھو نے جب منو کا دامن تھاما اور منو کے ساتھ پھولوں سے لدی ہوئی موٹر میں بیٹھ گئی۔

تو راجکماری نے محسوس کیا کہ آج اس کی رگوں میں کوئی انوکھا رس سرایت کرتا جا رہا تھا۔ مدھو اس کے جگر کا ٹکڑہ تھی اور منو ڈاکٹر دیو کا خون تھا۔

رشتے جوں کے توں رہے جیسے قدرت نے جوڑے تھے اور جب منو اور مدھو نے راجکماری کے گھر سے جدا ہو کر سرلا اور کرشن لال کے گھر کا خیر مقدم قبول کیا تو انہوں نے ڈاکٹر دیو کے قدم چھوئے۔ انہیں آشیرباد دیتے ہوئے ڈاکٹر دیو کو یوں محسوس ہوا۔ جیسے ممتا کے دونوں پتلے پتلے ہاتھ ڈاکٹر دیو کے دونوں ہاتھوں سے جڑ کر منو کو آشیرواد دے رہے ہوں۔

منو اس کا اپنا خون تھا۔ منو اس کی ممتا کا خون تھا۔

رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ ڈاکٹر دیو ابھی سونے ہی لگا تھا کہ اس کے کمرے کا بند دروازہ کھلا اور منو کا نوجوان بت ڈاکٹر دیو کی آغوش میں آگرا۔ "پتاجی۔۔۔" منو ڈاکٹر دیو سے لپٹ گیا۔ ڈاکٹر دیو نے سنبھلنا چاہا۔ آج جب منو سب کچھ جان چکا تھا تو ڈاکٹر کیونکر انکار کر سکتا تھا۔

"پتاجی۔۔۔۔۔ آپ عمر بھر مجھ سے اپنے آپ کو چھپاتے رہے ہیں۔ اب نہیں چھپا سکتے۔" منو کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا تھا۔ دیو سے کچھ کہا نہ گیا۔ وہ منو کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

"پتاجی۔۔۔۔ آپ ایک عظیم انسان ہیں۔" منو کے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ "آپ نے ساری عمر قربان کر دی۔ قانون نے آپ کو شوہر کی حیثیت سے قبول نہ کیا۔ قانون نے آپ کو باپ کی حیثیت سے قبول نہ کیا۔ قانون تو عام انسان کے لئے ہوتے ہیں۔ آپ تو غیر معمولی انسان ہیں۔ آپ قوانین سے بلند ہیں۔ آج تک کسی باپ نے اپنا فرض یوں پورا نہیں کیا۔ کسی باپ نے

آج تک اپنی عمر یوں نہیں گنوائی ہوگی۔ پتاجی.....۔"

اب دیو کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ آنکھوں میں اُمڈے ہوئے آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے اُس نے اپنی آنکھوں ہی میں روکنے کی کوشش کی۔ مگر یہ آنسو اُس کی آنکھوں میں کلبلاتے رہے۔ اور اُس کی پلکوں کو چیر کر بھی ٹپک پڑے۔ زندگی میں دیو کے یہ پہلے آنسو تھے۔

"تم سے یہ بات کس نے کہی ہے؟" دیو نے آہستہ سے پوچھا۔

"مجھے پتاکرشن لال نے خود بتایا ہے۔ آپ کو شاید معلوم ہو آج میری ۲۵ ویں سالگرہ تھی۔ ایک گھنٹہ ہوا انہوں نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔ آپ کا نام بھی بتا دیا۔ وہ کہتے تھے۔ دیو جی نے ساری عمر تمہاری خاطر قربان کر دی۔ میں تم سے جی بھر کے بیٹے کا پیار حاصل کر چکا ہوں۔ میں جانتا ہوں بیٹے کا پیار بہت طاقتور ہوتا ہے۔ دیو جی اگرچہ تم سے ہمیشہ پیار کرتے رہے ہیں۔ لیکن وہ ایک بات سے محروم رہے ہیں کہ تجھے کبھی بیٹا کہہ کر نہیں پکار سکے۔ میرے لئے تو صرف تم ہی تم ہو۔ مجھ سے چھین نہیں لئے جاؤ گے۔ مگر دیو جی کو بھی بھوکا نہ رہنے دینا۔ ایک بات اور بھی تھی۔ جب انہوں نے میری پیدائش کا حال بتایا تو اُنہیں یہ ڈر تھا کہ مجھ میں کہیں احساس کمتری نہ پیدا ہو جائے اس لئے انہوں نے مجھ سے کہا: "تمہارے لئے یہی سب سا بڑا فخر ہے کہ تم دیو جیسے انسان کا خون ہو۔"

"کرشن سچ مچ بہت ہی عظیم انسان ہے۔" دیو بولا۔

کچھ لمحے بیت گئے۔ دونوں ویسے ہی بیٹھے رہے اور پھر منو نے بڑی عقیدت کے ساتھ کہا۔ "پتاجی مجھے ساری بات سناؤ۔"

دیو ہنس پڑا اور کہنے لگا: "میں اُس وقت ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر رہا

تھا ۱۹۲۶ء کی بات ہے۔ میں گرمیوں کی چھٹیوں میں پہلگام گیا۔ وہاں ہمارے خیمے ایک دوسرے کے قریب تھے۔ میں ایک غریب گھرانے کا لڑکا تھا۔ وہ امیر گھرانے کی بیٹی تھی۔ وہاں ہم ایک دوسرے کے واقف ہو گئے۔ ہمارے جذبات اور خیالات میں امیری اور غریبی کا کوئی فرق نہیں تھا۔ اس کی خوبصورتی اور دانشمندی اس کے ماں باپ کی امیری سے زیادہ وسیع تھی۔ اُن پہاڑوں پر ہم جھیلوں اور وادیوں میں کھیلتے رہے۔ ہم نے اُن چوٹیوں پر چڑھتا سورج دیکھا۔ ڈوبتا سورج دیکھا۔ ہمیں کبھی یہ خیال بھی نہیں تھا کہ زندگی ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر دے گی۔ چندن اڑی کے پُل پر میں نے اس کی کئی تصویریں کھینچیں۔ اُن تصویروں میں وہ برف کی دیوی معلوم ہوتی تھی۔ اُس کا اصل نام کچھ اور ہی تھا۔ میں کبھی کبھی ہنس کر اُس سے کہا کرتا کہ تو نے مجھ جیسے سنگدل لڑکے کو پھر موہ اور ممتا میں لپیٹ لیا ہے۔ بس اُس نے اپنا نام ہی "ممتا" رکھ لیا۔ کہا کرتی تھی جتنے دن ممتا زندہ رہے گی تم اُسے کبھی چھوڑ کر نہیں جا سکو گے۔ پگلی ممتا۔ نہ مجھے معلوم تھا اور نہ ہی اُسے معلوم تھا کہ زندہ ممتا سے بھی الگ ہونا پڑتا ہے۔ قدرت اپنے کھیل کھلا کر رہتی ہے۔ ہمارے مکمل پیار نے یہ نہ سوچا کہ وہ ابھی قانون کی نگاہوں میں ادھورا تھا۔ ہم نے تو صرف بھگوان کو اپنا ساتھی مان کر ایک دوسرے کو منتخب کیا تھا۔ بیاہ کی رسم بھی اس سے بڑی نہیں ہو سکتی تھی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ قانون کی کوئی قیمت نہیں لیکن اس کی قیمت اتنی زیادہ نہیں ہے۔ کہ کئی زندگیاں ہمیشہ کے لئے اُس پر وار دی جائیں۔ ویسے بھی وہ عام لڑکیوں جیسی لڑکی نہیں تھی۔ میں عام لڑکوں جیسا لڑکا نہیں تھا۔ ممتا کے یہاں بچہ ہونے والا تھا۔ جب اُس کے والدین نے مجھ سے بیاہ کر دینے سے صاف انکار کر دیا

اور انہوں نے ہمارے گندھرو دواہ کو قبول نہ کیا۔ وہ نام اور عزت کو بھی چھوڑ سکتی تھی۔ ماں باپ کے پیار کو بھی چھوڑ سکتی تھی۔ لیکن انہوں نے چوبیس گھنٹے کے اندر قیدی بنا دیا۔ اس کا پیغام مجھے زبانی پہنچایا گیا کہ میں نے اس کی زندگی ہمیشہ کے لئے خراب کر دی ہے۔ وہ مجھ جیسے عام اور غریب گھر کے لڑکے کے ساتھ ہرگز شادی نہیں کر سکتی۔ اور نہ جانے کیا کیا کچھ اس کی طرف سے مجھے بتایا گیا۔ میں نے وہ باتیں کبھی سچی تسلیم نہیں کیں۔

تیرا جنم ہوا تو تجھے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ میں بھٹکتا رہا۔ ہسپتال کے ڈاکٹر سے ملا۔ اس کو سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ میں ڈاکٹروں کی تعلیم حاصل کرنے والا لڑکا پندرہ روز کے بیٹے کو لپیٹ کر اپنے دوست کرشن لال کے پاس لے آیا۔ اُس نے میری دوستی کی لاج رکھ لی۔ اس کے یہاں کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس طرح تم میری آنکھوں کے سامنے پرورش پاتے رہے۔ میں نے کرشن لال کو اور تو سب کچھ بتا دیا لیکن تیری ماں کا نام اور اس کا پتہ نہ بتایا۔" ڈاکٹر دیو نے منو کے آگے اپنے دل کا سارا بوجھ ہلکا کر دیا۔

"لیکن میری ماں کا پتہ مجھے تو بتا دیجئے۔" منو نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

"اس راز کو منو راز ہی رہنے دو۔"

"کیوں پتا جی۔؟"

"ماں باپ نے اس کی کسی امیر گھرانے میں شادی کر دی تھی۔ میں نے اُس کے بعد اُسے دیکھا تک نہیں۔"

"کیا اس کے بارے میں کچھ سُنا بھی نہیں؟"

"بہت تھوڑا۔ انہی دنوں کی بات ہے۔ ایک بار تیرے لئے ایک آیا

رکھی تھی۔ وہ آیا ان کے گھر سے ملازمت چھوڑ کر آئی تھی۔ اُس نے بتایا تھا ممتا کے یہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی۔ ممتا نے اس کا نام رنجو رکھا تھا میں سمجھتا تھا کہ اُس نے اپنی بچی کا نام رنجو کیوں رکھا تھا۔ پہلگام میں اس نے ایک دو بار مجھ سے کہا تھا۔ کہ ہم اپنے بچے کا نام رنجو رکھیں گے۔ وہ اپنی بیٹی میں تمہیں ڈھونڈنا چاہتی تھی۔ میں نے بھی اس کے کہنے پر تیرا نام منورنجن چُنا تھا۔ اور اس طرح میں نے رنجو کی جگہ چھوٹا نام "منو" منتخب کر لیا۔ تمہیں رنجو کہہ کر مجھے اس کی بہت یاد آتی تھی۔ اُس نے غلطی کی کہ اپنی بیٹی کا نام یہ چُنا۔ اس نام سے وہ تمہیں بھول نہیں سکی ہوگی۔ یہ دونوں چیزیں اس کی نئی زندگی کے لئے خطرناک ہیں۔ میں جان بوجھ کر اس کے نزدیک نہیں گیا۔ میں چاہتا تھا۔ کہ وہ آہستہ آہستہ اپنی نئی زندگی سے مانوس ہو جائے۔"

"لیکن پتا جی۔ اگر آپ چاہیں تو کبھی اس کا پتہ تو چلا سکتے ہیں۔"

"وہ میری زندگی میں سدا زندہ رہے۔ لیکن میں اس کی زندگی میں سے روپوش ہو جانا چاہتا ہوں۔"

"پتا جی۔ آپ نے اتنا کچھ بتا دیا ہے۔ اب یہ بھی بتا دو کہ وہ کس گھرانے میں ہیں۔؟"

"مجھے اب کی تو خبر نہیں۔ فسادات سے پہلے وہ لاہور میں تھے۔ لارنس گارڈن کے قریب ان کی کوٹھی تھی۔ اس کے پتی کا نام جگدیش چندر ہے منو۔"

"جی۔"

"کس سوچ میں ڈوب گئے ہو۔؟"

"کچھ نہیں۔"

"منو مجھے بتا دو۔"

"کچھ نہیں۔ مدھو کے کالج میں ایک لڑکی پڑھتی ہے۔ اس کا نام رنجو ہے۔ مجھے اس کا خیال آگیا تھا۔"

"پگلا — کیا یہ ضروری ہے کہ وہ رنجو وہی رنجو ہو۔ ایسے حادثے ناولوں اور ناٹکوں میں ہوتے ہیں۔ زندگی میں نہیں۔"

"پتا جی۔ کئی بار صداقت تصور سے زیادہ حسین اور حیرت انگیز ہوتی ہے۔"

"ہاں منو۔ مگر چھوڑو۔ کون سی سوچ میں ڈوب گئے ہو۔ میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔"

"جی۔"

"جب کبھی تم اُسے یاد کرو فرطِ عقیدت سے سر جھکا دینا۔ میں ابھی تک اس کی پرستش کرتا ہوں۔ تم نہیں جانتے۔ مگر میری بات پر یقین کرو۔ وہ ایک دیوی سے زیادہ سچی، ایک پاکدامن سے بھی زیادہ پاکیزہ تھی۔ میں عمر بھر اس کی یاد کے سہارے زندہ رہا ہوں۔"

"پتا جی۔!" منو کو اس سے آگے اور کچھ کہنے کی ضرورت نہ رہی کہ اس کے دل میں ماں کے لئے کس قدر عقیدت تھی۔ اس کے چہرے پر پرستش کے جذبات چھا گئے تھے۔

"منو۔"

"جی۔"

"ضلع ہزاری باغ مانچی میں ہسپتال بنانا چاہتا ہوں۔ یو۔پی کے دیہات میں بہت بیماریاں ہیں۔ برسات میں ہزاروں گھر صرف بخار ہی سے برباد ہو جاتے ہیں۔"

"تمہارا۔ یہاں ہسپتال میں رہنا ہی بہت اہم ہے۔ رمیش کیا کہتا ہے"
"آپ کے حکم کا منتظر ہے۔ آپ تو جانتے ہیں۔ وہ آپ کے ایک اشارہ پر اپنی جان نچھاور کر سکتا ہے۔ رانچی تو کیا آپ اُسے کہیں بھی جانے کے لئے کہہ سکتے ہیں۔ وہ ہنستا ہُوا آپ کے ساتھ چل پڑے گا۔"

"وہ بیش قیمت نوجوان ہے۔ مجھے بہت پیارا لگتا ہے۔ اچھا اُسے کہہ دینا۔ ایک دو دن میں تیار ہو جائے۔ میرے ساتھ چلے۔ میں رانچی سارا انتظام کرنے کے لئے جا رہا ہوں۔"

"بہت اچھا" منو بولا۔

تھوڑی دیر کے بعد جب منو گھر واپس جا رہا تھا۔ تو وہ سوچ رہا تھا۔ جب اُپندر والا حادثہ ہُوا تھا۔ میں رنجو کے گھر بھی گیا تھا۔ رنجو کی ماں سے ملا تھا لیکن نہ تو میں رنجو کی ماں کا نام جانتا تھا۔ اور نہ ہی اس کے پتا کا۔ یہ تو میں جانتا ہوں کہ وہ لاہور سے آئے ہیں۔ لیکن لاہور سے تو کئی لوگ آئے ہیں۔ بہت سی لڑکیاں رنجو بھی ہو سکتی ہیں۔ رنجو کی ماں بہت پیاری عورت ہے۔ ایسی عورتیں تو گنی چنی ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر دیو رمیش کو ساتھ لے کر رانچی چلا گیا۔ ڈاکٹر دیو کے خط ہر دوسرے تیسرے روز منو کے نام آیا کرتے۔ ان میں بہت کچھ لکھا ہوتا۔

ڈاکٹر نے وہاں کچھ زمین لے لی تھی۔ اور وہ ہسپتال کی تعمیر میں مصروف تھا۔ کبھی اُس کا خط آتا: "بہار کے علاقے میں بڑے جنگل ہیں۔ ان میں مانجھی، بردھر، آگاؤں، گنجو، تمری، وساہ، سُنبھی، کرمی کتنے ہی لوگ رہتے ہیں۔ مانجھی بہت تیر انداز ہوتے ہیں۔ جب اُنہیں پتہ چلتا ہے کہ فلاں جگہ شیر، چیتا، لکڑ بگڑ، بارہ سنگھا ہے۔ سب تیر کمان لے کر دوڑ پڑتے ہیں۔ بنا شکار کئے واپس آنا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ جانوروں سے بڑی ہوشیاری کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے ہیں۔ اسی طرح بردھر جاتی کے لوگ بھی بڑے شکاری ہوتے ہیں۔ شکار ہی اُن کی روزی ہے۔ یہ لوگ کوند، کنود، کٹہر، مہوہ، تاڑ، کھجور، جامن، آم، ڈومر، پتڑالہ، کھیل، کسم، پٹھور جیسے پیڑوں کے پھل کھا کر گذر بسر کرتے ہیں۔ کبھی کبھی اُنہیں آلو، شکر قندی،

گوندلی جیسے دیگر ناچ بھی میلے میں آجاتے ہیں۔" کبھی ڈاکٹر دیو کا یہ خط بھی آتا کہ ہسپتال کی تعمیر شروع ہو گئی ہے۔

خط پڑھ کر منو کی آنکھوں کے آگے کچھ ابھرنے لگتا۔ آج ڈاکٹر دیو کا ایک خط آیا۔ جس میں لکھا تھا۔ "جھومر جنگلیوں کا ایک مشہور ناچ ہے۔ لیکن، مانجھیوں کے جھومر میں ایک خاص دلکشی ہے۔ مرد اور عورتیں دو دن اور ایک رات لگاتار ناچتے رہتے ہیں۔ کھانے پینے کے وقت بھی ناچ کے تسلسل کو کبھی ٹوٹنے نہیں دیتے۔ اُن کے کالے بدن ناچ کا پینترا بدلتے ہوئے چمک اُٹھتے ہیں۔ شادی کے جھومر میں دولہا اور دلہن بھی ناچتے ہیں شراب کی مستی ہوتی ہے۔ جھومر کی لَے ہوتی ہے۔ اور گیتوں کے بول ہوتے ہیں ان کی غریبی کے آگے امیری سرنگوں ہو جاتی ہے۔"

منو نے یہ خط پڑھا تو خط اس کے ہاتھ ہی میں رہ گیا۔ منو کا سر جھکتا جھکتا کرسی کی پشت سے جا لگا۔ منو نے دیکھا۔ "ایک سہانا جنگل تھا۔ ویران اور بیابان۔ وہاں آکر کچھ جنگلی لوگ ناچنے لگے۔ کالے کالے۔ پھٹے پرانے کپڑوں والے۔ وہ ناچتے ناچتے چمک رہے تھے۔ اُن کے چہرے خوبصورت ہو گئے۔ اُن میں کچھ جانے پہچانے چہرے بھی تھے۔ ایک ڈاکٹر دیو تھا۔ ایک ممتا۔ باقی جھنڈ میں اُڑتے ہوئے پنچھیوں کی طرح ناچ رہے تھے۔ دیو نے ممتا کا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔ وہ ناچ رہے تھے۔ دھرتی ناچ رہی تھی۔

منو دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔ مدھو نے آکر اس کے کندھے جھنجھوڑے منو کا تصور ٹوٹ گیا۔ منو خواب کی اس جھلک میں سرتاپا مسرت بنا ہوا تھا۔ آج منو نے پہلی بار جنم دینے والی اپنی ماں کو خواب میں دیکھا تھا منو نے کبھی ممتا کو دیکھا نہیں تھا۔ آج اُس نے اپنے تصور میں ممتا کو دیکھا۔

مسرت کی اس شیریں موج نے جب زندگی کی پتھریلی دیوار کی طرف دیکھا تو قطرہ قطرہ ہو کر بکھر گئی۔ منو کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ منو نے سوچا:

" پیار تو اس دھرتی کا مقدر ہے لیکن ممتا تباہ ہوئی۔ دیو تباہ ہوا۔ وہ زندگی کے آباد شہروں میں کبھی جھومر نہ ناچ سکے۔ کبھی ایک دوسرے کا ہاتھ نہ تھام سکے۔ کیونکہ وہ ذات کے مانجھی نہیں تھے۔ مانجھیوں جیسے جنگلی نہیں تھے۔ وہ تو تہذیب و تمدن کی دُنیا میں دانشمند اور ذی ہوش تھے۔ وہ جھومر نہ ناچ سکے۔ وہ ہاتھ نہ تھام سکے۔

آج نہ جانے کیوں منو کو مدھو کے کالج والی لڑکی کا رہ رہ کر خیال آ رہا تھا۔ دوپہر کو منو رنجو کے گھر کی طرف چل پڑا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا اگر رنجو نے سچ سچ اپنے پتا کا نام جگدیش چندر بتا دیا تو وہ زندگی کا یہ اچانک ملاپ کیسے برداشت کر سکے گا۔ اگر رنجو نے اپنے پتا کا نام کچھ اور بتایا تو وہ بالکل مایوس ہو جائے گا۔

منو رنجو کے گھر پہنچ گیا۔ رنجو بڑے تپاک سے ملی۔ وہ منو کو کچھ زیادہ نہیں جانتی تھی۔ اور نہ ہی منو نے اُسے اپنے بیاہ پر بلایا تھا۔ صرف اُپندر والے حادثے کے دن ملے تھے۔

منو دھڑکتے ہوئے دل سے اِدھر اُدھر کی معمولی باتیں کرتا رہا۔ اور پھر بڑے حوصلہ سے رنجو کے پتا کا نام پوچھا۔

" میں نے شاید تمہیں پہلے بھی بتایا تھا۔ کہ ہم لاہور رہا کرتے تھے۔ میرے پتا کی ساری جائیداد ہندوستان کے بٹوارے نے ہم سے چھین لی۔ اور سب سے بڑی چوٹ یہ لگی کہ ہم سے پتا جی بھی چھن گئے۔ ان کی موت بڑے

اندوہناک طریقے سے ہوئی۔ میری ماں بہت دنوں سے بیمار رہتی ہیں۔ اُن کے لئے یہ صدمے ناقابل برداشت تھے۔" رنجو کہہ رہی تھی۔

"آپ کے پتا کا نام . . . . ." منو کا دل دھڑکنے لگا۔

"جگدیش چندر۔" رنجو بولی۔

منو نے یہ نام سنا۔ منو اپنے چہرے پر اُبھرے ہوئے جذبات کو چھپا نہ سکا۔

"تم بہت حیران ہوئے ہو۔ کیا تم اُنہیں جانتے تھے۔؟"

"نہیں۔ میں نے اُنہیں کبھی نہیں دیکھا۔ ویسے ہی دل میں گھبراہٹ پیدا ہوئی ہے۔" منو بولا۔ اپنے شک کو دُور کرنے کے لئے منو رنجو کی ماں کا نام بھی پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن ماں کا نام پوچھنا بہت غیر قدرتی معلوم ہو رہا تھا۔

منو خاموش رہا۔ پھر وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے رنجو کی ماں کے پاس گئے۔ زمانہ اور ہمیشہ کے روگ نے اگرچہ اس کے چہرے پر کوئی تابانی باقی نہیں رہنے دی تھی۔ پھر بھی ایک شیریں جذبہ اس کے چہرے پر موجود تھا۔ منو کو یوں محسوس ہُوا کہ وہی اس کی ماں تھی۔ منو کا جی چاہا کہ وہ دوڑ کر ماں سے لپٹ جائے اور اس کا بیٹا اُسے دیدے لیکن وہ سنبھل گیا۔ ماں کی بیماری کو کسی کی یاد سے ایک اور دھکا نہ لگے۔ وہ ماں کو پاتے ہوئے اسے کہیں گنوا نہ بیٹھے۔

منو مسکرا کر اس کی چارپائی کے ایک گوشہ پر بیٹھ گیا۔ رنجو کی ماں کو منو پہلے دن ہی پیارا لگا تھا۔ جب اُپندر کے جنگل سے بچا کر وہ رنجو کو گھر چھوڑنے آیا تھا۔

آج رنجو کی ماں نے شکوہ کیا کہ اتنے دن تک کیوں نہیں آیا تھا منو کہتا رہا وہ بہت شرمندہ ہے کہ اتنے دن تک نہ آسکا۔ ان دنوں اُس کی شادی ہوگئی تھی۔ اور وہ مصروف رہا تھا۔

اتنے میں رنجو اپنے پتا کی تصویریں لے آئی منو کو دکھاتی رہی۔ ایک تصویر میں رنجو کی ماں کی تصویر بھی تھی۔ منو دیکھتا رہا اور پھر بول اٹھا۔ "ماتاجی کا نام بھی بہت سُندر ہوگا۔" منو نے یہ بات کہہ تو دی۔ لیکن اُسے خود یہ محسوس ہُوا کو جیسے یہ بہت ہی غیر قدرتی تھا۔ لیکن بات اس کے مُنہ سے نکل چکی تھی۔ اب واپس نہیں آسکتی تھی۔

رنجو ہنس پڑی۔ اُس کی ماں بھی ہنس پڑی اور بولی۔ "میرا نام۔ میرے لئے ضرور حسین ہے۔ دوسروں کو شاید عجیب لگے۔ میں نے اپنا نام خود رکھا تھا۔ ممتا۔!"

منو سوچے سمجھے بغیر ماں کی طرف جُھک گیا۔ اس سے آگے بڑھنے سے پہلے اُس نے خود کو سنبھالا اور پھر ماں کا ہاتھ تھام کر بولا۔ "اب بہت جلد اچھی ہو جائیے نا۔"

"منو بیٹا تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔" ممتا نے کہا۔

"پھر میرا کہا مانو اور جلد صحت یاب ہو جاؤ۔"

"نہیں منو۔ زندگی کا دھارا پہلے ہی بہت طویل ہو چکا ہے۔ صرف ایک خیال ہے کہ رنجو کی شادی......"

"آپ رنجو کا بیاہ کریں گی۔ اسے خوش دیکھیں گی۔ آپ نے مجھے بیٹا کہا ہے۔ اس لئے میری ہی خاطر زندہ رہو......" منو کا بہت جی چاہا کہ وہ کچھ اور بھی کہے لیکن خاموش رہا۔ پھر اُس نے رنجو سے کہا۔ "تم بھابی سے کب ملوگی؟"

تیرے کالج کی بھولی مدھو اب تیری بھابی بن چکی ہے۔"

یوں باتیں کرتا ہُوا اور پھر آنے کا وعدہ کر کے منو چلا گیا۔

منو اب قریب قریب ہر روز رجّو کے گھر جایا کرتا تھا۔ رجّو کو بہن کہہ کر بُلاتا تھا۔ اور رجّو کی طرح ممتا کو ماں کہہ کر پکارتا تھا۔ ابھی تک اُس نے اور کچھ نہیں بتایا تھا۔ ممتا کے گھر میں ایک کمی محسوس ہونے لگی۔ ماں بیٹی اس کا انتظار کیا کرتیں۔ ممتا چارپائی پر لیٹی ہوئی دروازے کی طرف دیکھتی رہتی ممتا چارپائی سے اُٹھ نہیں سکتی تھی۔ کمزوری دن بدن بڑھ رہی تھی۔ لیکن یہ دن کچھ مسرت انگیز ہو گئے تھے۔

"ماتا جی۔ کبھی کبھی بچے ضد بھی کیا کرتے ہیں"۔ ایک روز منو نے بڑے پیار سے کہا۔

"اتنا بڑا بچہ کیا ضد کرے گا"۔

"اگر کوئی ضد کر بیٹھے تو کیا اس کی بات مانو گی۔؟"

"بچے ضد کرتے وقت یہ سوال نہیں کیا کرتے۔ وہ تو منوا کے چھوڑتے ہیں منو اپنی ماں کی ذہانت کا قائل ہو چکا تھا۔ وہ ہنس پڑا"۔

"اچھا تو ضد کرتا ہوں اور منوا کے رہوں گا"۔

اتنے اچھے بچے کی ضد بھی حسین ہوگی"۔

"تو پھر کچھ دنوں کے لئے تیار ہو جاؤ۔ میں آپ کو کہیں لے جانا چاہتا ہوں"۔

"ہمیں کوئی جنون نہیں۔ ہم تو یہیں رہیں گے"۔ پاس بیٹھی ہوئی رجّو نے کہا۔

"ماں کو ضد سے منوایا جاتا ہے اور بہنوں کو حکم دیا جاتا ہے"۔

منو ہنس پڑا۔

"کہاں ۔۔۔؟" ممتا نے پوچھا۔

"جہاں میں جاؤں گا - وہیں آپ بھی چلیں گی - دراصل میرے پتا بھی ڈاکٹر ہیں - میری نئی نئی ڈاکٹری ان کے تجربہ کے آگے کچھ بھی نہیں - ان کا یہاں بھی ایک ہسپتال ہے - لیکن آج کل وہ ہزاری باغ ضلع میں ہیں - وہاں وہ نیا ہسپتال تعمیر کروا رہے ہیں - دیہات کے لئے وہ۔"

"پگلے بیٹا - مجھ میں اتنے طویل سفر کی ہمت کہاں ہے - میری زندگی اتنی ضروری نہیں - منو - جس کے لئے اتنا کچھ کیا جائے۔" ممتا نے یاس انگیز لہجہ میں کہا -

"ضروری ہے یا نہیں - یہ مسئلہ ہم خود حل کریں گے - آپ کی صحت کو آپ کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتے۔"

"اگر تم مجھے اپنے پتا کو دکھانا ضروری سمجھتے ہو تو جب کبھی وہ دلی آئیں گے - اُس وقت سہی۔"

"نہیں ماں - میری ضد آپ کو ماننی پڑے گی - دیہات کا ماحول میلوں تک جنگل ہی جنگل - قدرت کے اس قدر نزدیک زندگی کچھ اور ہی ہوتی ہے - شہروں کے جلوس جیسی بھیڑ میں تو انسان کا دم گھٹنے لگتا ہے - میری اچھی ماں میری بات مان جاؤ۔" منو کی ضد التجا میں تبدیل ہو گئی -

ممتا کے جذبات میں ہلچل پیدا ہوئی - چہرے پر ایک چمک سی آ گئی - وہ جیسے پیارے بیٹے کے ساتھ قدرت کے ماحول میں گھل سکے گی منو اور رنجو دونوں بہن بھائی کی طرح کھیل سکیں گے - وہ سہانی اور آزاد زندگی میں سانس تو لے سکے گی - ممتا مان گئی - پتی کی موت کے بعد اس کی زندگی کا سانس بھی واقعی اکھڑ چکا تھا -

نہیں کیا - اگرچہ میں ابھی ٹھیک طرح اُٹھ نہیں سکتی - محتاج ہو گئی ہوں مگر

آج برسوں کا بیمار بدن بھی ہلکا ہلکا لگتا ہے۔"

گاڑی کے ڈبہ میں وہ تینوں اس طرح محسوس کر رہے تھے۔ جیسے وہ ایک چھوٹا سا گھر ہو۔ تینوں افراد کا جیسے ایک چھوٹا سا کنبہ ہو۔ منو جیسا عقلمند اور جوان بیٹا اُس گھر میں تھا۔

"ماں۔ اپنے بیتے ہوئے ایام کی کوئی خوبصورت بات سناؤ۔" منو ممتا کے ساتھ لپٹ کر بیٹھ گیا۔ کئی بار وہ ممتا کو "جی" کہہ کر بھی نہیں بلاتا تھا صرف "ماں" کہتا تھا۔

ممتا مسکرا کر رہ گئی۔ ممتا کو خیال آیا کہ وہ زندگی کے کئی طویل برس اسکول کے کوارٹر میں گذار چکی ہے۔ جہاں سورج ہر روز اپنے معمول پر نکلتا تھا۔ اور ڈوب جاتا تھا۔ نہ کسی صبح کو کوئی آرزو ہوتی اور نہ شام کا کوئی انتظار زندگی مشین کی ہموار اور یکساں گڑ گڑاہٹ کی طرح چلتی رہی۔ ممتا کی عمر بیت گئی۔ ممتا الجھی رہی۔ منو نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اگر زندگی یوں ہی چلتی جائے۔ اور اس وقت تک اس سفر کے دوران

ایک دو دن میں ہی رنجو، منو اور ممتا نے ٹرین میں سیٹیں ریزرو کروالیں۔ ان کے ساتھ ایک ایک بستر، ایک بکس اور چھوٹی چھوٹی دو تین چیزیں تھیں۔ سفر لمبا تھا اور گاڑی صرف ایک بار تبدیل کرنی پڑتی تھی۔ منو نے فرسٹ کلاس کا ڈبہ ریزرو کررکھا تھا۔ دو سیٹوں والا ڈبہ، انھوں نے پیسے تین نشستوں والے ڈبہ کے خرچ کئے تھے۔ مگر بیٹھے دو نشستوں والے ڈبہ میں ممتا بڑے آرام سے رہی۔ گاڑی چل پڑی۔

"منو۔ یہ سفر تو بہت اچھی طرح کٹ رہا ہے۔ اتنا ہلکا سفر تو پہلے کبھی کوئی اسٹیشن نہ آئے۔ جب تک کہ یہ سفرِ حیات اپنی آخری منزل پر نہ پہنچ

جائے ۔“ ممتا نے تھوڑی دیر کے بعد کہا۔

”ہاں ۔ شاید کسی اسٹیشن پر کوئی خوشی کھڑی ہوئی زندگی کی راہ تک رہی ہو ۔ ہاں یہ گاڑی راستے میں کسی اسٹیشن پر تو کھڑی ہونی چاہیئے ۔“ منو ہنس پڑا ۔

” نہیں منو ۔ تو نہیں جانتا ۔ خوشیوں کے اسٹیشن میرے سفر حیات کے راستے میں نہیں آتے ۔“ زرد اور کمزور ممتا کروٹ بدل کر لیٹ گئی ۔

منو اور رنجو تاش کھیلتے رہے ۔ ممتا دیکھتی رہی ۔ منو اور رنجو ہارتے اور جیتتے رہے ۔ تاش سمیٹتے اور بکھیرتے رہے ۔ گاڑی کے اس آشیانہ میں پنچھیوں کی طرح چہکتے رہے ۔ دو دن گذر گئے ۔

آتے ہوئے راجکماری کو اس سفر اور ہمسفروں کے متعلق بہت کچھ بتا آیا تھا ۔ اسٹیشن پر اُتر کر اُس نے مدھو اور کماری کو اپنے پہنچنے کا تار دیا ۔

رانچی روڈ کے اسٹیشن پر اُتر کر ڈاکٹر دیو والے گاؤں پہنچنے کے لئے کچھ میل تک موٹر بس میں جانا پڑتا تھا ۔ وہاں ایک چھوٹی سی بستی تھی ۔ چھوٹا سا بازار تھا ۔ اور کچھ فاصلہ پر ڈاکٹر کا نیا نیا ہسپتال تھا ۔ پہاڑی اور میدانی دونوں طرح کا ماحول آپس میں گڈمڈ تھا ۔ ایک گاؤں دوسرے گاؤں سے کچھ میلوں کے فاصلے پر واقع تھا ۔ لوگ زیادہ تر جنگلی ٹھیکیداروں کے یہاں مزدور تھے ۔ سارا دن لکڑیاں کاٹتے ۔ لکڑی سے کوئلہ بناتے ۔ شام کو پتلون میں تاڑی پیتے ۔ کبھی کبھی کوئی قتل بھی کرتے ۔ انتہائی سیاہ اور زردہ پتیوں کا ایک چھوٹا سا باغ ہسپتال کی دیوار سے وابستہ تھا ۔ کُھلی دھوپ میں ڈاکٹر دیو صبح کا تھکا ہُوا کچھ دیر سے آرام کرسی پر لیٹا ہُوا تھا ۔ اتنے میں بچہ اُٹھائے

ہوئے گاؤں کی ایک عورت آئی۔ بچہ کچھ زیادہ ہی بیمار تھا۔ ڈاکٹر کو گھر بلانے کا اُسے خیال آیا ہی نہیں ہوگا۔ اس لئے وہ بچہ کو اُٹھا کر لے آئی۔

ڈاکٹر دیو دکھیوں کا دُکھ دُور کرنے کے لئے وقت، بے وقت یعنی ہر وقت تیار رہتا تھا منو ڈاکٹر دیو کے نقشِ قدم پر چلنے کے لئے بیتاب تھا۔ اس کے لئے بھی دن رات برابر تھے۔ ڈاکٹر دیو مریض کو کمرے میں لے جاکر دیکھ رہا تھا۔

احاطے کے باہر ایک موٹر رُکی۔ اُس سے منو اُترا، رنجو اُتری۔ اور ممتا اُتری۔ سامان اُتار لیا گیا۔ سفر کی طوالت اور تھکان سے علاقہ کی کھُلی فضا اور ہریالی نے زیادہ اثر کیا۔ ممتا کا برسوں سے بیمار چہرہ تازہ اور شاداب نظر آرہا تھا۔ ممتا ہنس رہی تھی۔ "دوا شاید اثر کرے یا نہ کرے لیکن اس سفر نے مجھے کچھ دنوں کے لئے اور زندگی عطا کر دی ہے۔"

منو ابھی تک یہ گتھی نہیں سلجھا سکا تھا کہ وہ رنجو کے سامنے ممتا کو کیسے ڈاکٹر دیو کے پاس لے جائے گا۔ نہ جانے ممتا پر کیا اثر ہو۔ رنجو کو کچھ معلوم نہیں۔ وہ گھبرا جائے گی۔ رمیش نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب اندر ایک مریض کو دیکھ رہے ہیں۔ رمیش سے اجازت لے کر منو ممتا اور رنجو کو ایک الگ تھلگ کمرے میں لے گیا۔ تھکی ہوئی ممتا چارپائی لیٹ گئی۔ رمیش چائے کا انتظار کرنے لگا۔

یہ وقت منو کے لئے بہت ہی عجیب تھا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

"رنجو بہن ۔ میں تمہیں تب مانوں اگر تم مجھے اپنے ہاتھ سے پپیتا توڑ کے دکھاؤ۔" منو نے رنجو کو ہسپتال کی دیوار کے پاس پپیتوں کا باغ دکھایا۔

"یوں کیوں نہیں کہتے کہ پپیتا کھانے کو جی چاہتا ہے۔" رنجو ہنس پڑی اور پپیتے

توڑنے چلی گئی۔ اب منو کا دل پھر دھڑک رہا تھا۔ ایک عظیم لمحہ قریب آرہا تھا۔ منو خود ڈاکٹر دیو کے پاس نہ جا سکا۔ رمیش سے کہا کہ وہ ڈاکٹر دیو کو ادھر بھیج دے۔ خود منو ممتا کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"منو تم نے مجھے اپنے پتا کا نام نہیں بتایا۔" ممتا کو معلوم تھا کہ ڈاکٹر صاحب آرہے ہیں۔ منو نے سوچا اچانک ملاپ کی بجائے وہ کیوں نہ کوئی اشارہ کہہ دے۔

"ڈاکٹر دیو راج" منو بولا۔

"کیا کہا۔؟" ممتا چونک پڑی۔

"ڈاکٹر دیو راج" منو نے اپنی آواز میں لرزش کو روکتے ہوئے کہا۔ اور پھر ممتا کی طرف گہری نظروں سے دیکھا۔ "تمہاری ماتا کہاں ہے؟" ممتا کا دل گھبرا رہا تھا۔ وہ چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"میری ماتا" منو ہنس پڑا۔

اتنے میں ڈاکٹر دیو کمرے میں آچکا تھا۔

ممتا نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ وہی دیو تھا۔ کیا وہ پہچان نہیں سکتی تھی۔ وہ تو دیو کو اپنے اگلے جنم میں بھی پہچان لیتی۔ ابھی تو صرف پچیس برس ہوئے تھے۔

"آپ..." ممتا کو صرف دیوار کا سہارا لینا پڑا اور اس کے چہرے پر زردی چھا گئی۔

"آپ" اس لفظ میں ایک اور آواز پیدا ہوئی۔ آواز میں کچھ خدوخال ابھرے کل منو کا تار آیا تھا۔ "۲۶ تاریخ کی صبح کو پہنچوں گا۔ کوئی میرے ساتھ بھی ہے۔" تار کے الفاظ سے گہرا مطلب بھی ابھرا۔ ڈاکٹر دیو نے ممتا کے

کندھے کے قریب سر جھکا کر کہا۔" ہاں ۔میں۔"

منو جانتا تھا کہ ممتا بڑی کمزور ہے۔ اس نے ہاتھ پکڑ کر ممتا کو چارپائی پر بٹھا لیا۔ پھر آہستہ سے لِٹا دیا۔

اتنے میں رنجو بھی تین پکے ہوئے پپیتے لے کر آ گئی۔ ڈاکٹر دیو نے رنجو کو دل ہی دل میں پہچان لیا اور پھر اُسے گلے سے لگا لیا۔

رمیش نوکر کے ہمراہ چائے لے کر آ گیا۔ رنجو پیالیوں میں چائے بنانے لگی۔ ڈاکٹر کو چائے کی پیالی پکڑاتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"میرے ماتا جی راضی ہو جائیں گے نا۔؟"

ڈاکٹر دیو نے پھر ایک بار رنجو کو پیار کیا۔ آنکھوں کے گوشوں میں آئے ہوئے آنسو لوٹ گئے۔ آہستہ سے کہا۔" میں اِن کی زندگی بھگوان سے مانگ لوں گا۔"

چائے پی لی گئی۔ رمیش رنجو کو ہسپتال دکھانے کے لئے لے گیا۔ وہاں ایک اور مریض آ گیا تھا۔ ڈاکٹر دیو کو بھی جانا تھا۔

"کیا میں جاؤں ۔۔؟" ڈاکٹر دیو نے ممتا کی چارپائی پر ذرا جھک کر کہا۔

ممتا نے جھکے ہوئے چہرے کی طرف جی بھر کے دیکھا۔ اس سے کچھ کہا نہ گیا۔ اس نے نفی میں اپنا سر ہلایا۔ دیو ہنس پڑا۔

ممتا کو خیال آیا۔ منو کیا سوچتا ہو گا۔ وہ بڑی نرمی سے بولی۔ "منو جی۔ آپ کو شاید علم نہیں۔ یہ تو میرے بہت دیر کے واقف ہیں۔"

"صرف واقف ہی۔؟" ڈاکٹر دیو نے مسکرا کر پوچھا۔

"ماں کسے خبر نہیں۔ کیا مجھے۔ تیرے رنجو کو ۔۔" منو ماں کی چھاتی سے لگ گیا۔

"رنجو — میرا رنجو —" اب کے ممتا بیہوش ہو گئی۔ ڈاکٹر دیو نے ایک انجکشن لگایا۔ تھوڑی دیر کے بعد ممتا میں طاقت آ گئی۔

"میں نے تمہارے رنجو کو اتنا بڑا کر دیا ہے۔" ڈاکٹر دیو برس کی کمائی ہوئی سنجیدگی سے ہنس پڑا۔

"کیا آج کا اخبار دیکھا ہے۔؟" منو نے چائے پیتے ہوئے دیو سے پوچھا۔

"آج کا —؟ ابھی وقت نہیں ملا۔"

"بمبئی میں سمندری طوفان آیا تھا۔ مکانوں کی چھتیں اڑ کر دور جا پڑی ہیں۔ ریل کی پٹڑیاں اکھڑ گئی ہیں۔ بہت جانی نقصان ہوا ہے۔"

"یہ طوفان۔ یہ بگولے بھی بہت زبردست ہوتے ہیں۔" ڈاکٹر دیو نے یہ خبر سن کر کہا۔

ممتا ڈاکٹر دیو کے منہ کی طرف دیکھتی رہی۔ رنجو، منو اور رمیش بھیلوں کا ناچ دیکھنے کے لئے جا رہے تھے۔ وہ چائے پی کر چلے گئے۔ کمرے میں صرف ممتا اور ڈاکٹر دیو رہ گئے۔

"پہلے میرے پاس سب کچھ تھا۔ مگر میں اپنی زندگی میں آپ کو کچھ نہ دے سکی۔ اب تو میرے ہاتھ خالی ہیں۔" ممتا سوچنے لگی۔ "دیو نے اتنی طویل زندگی صرف یادوں کے سہارے بسر کی ہو گی۔"

"ممتا سماج کے ہاتھ خالی ہیں۔ لیکن تمہارے ہاتھ کبھی خالی نہیں رہے مجھے اور کچھ نہیں چاہیئے۔

"میں —" ممتا نے سر جھکا لیا۔

"ممتا تو اپنے مرحوم شوہر کے نام کو سدا سنبھال کر رکھے گی۔ لیکن

تیرا پیار میرا تھا اور آج بھی میرا ہے ہمارا پیار اب رشتوں کا محتاج نہیں۔ میں اس دنیا میں صرف تیری موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے اتنے دن زندہ رہا ہوں۔ اب میں تجھے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ سکتا ہوں۔ اس سے بڑی اور کیا مراد ہو گی۔ اس منزل میں نہ جوانی ہے۔ نہ بڑھاپا ہے اور نہ ہی جسم ہے۔" شام کی سردی اُتر رہی تھی۔ ڈاکٹر دیو نے گرم شال ممتا کے کندھوں پر ڈال دی۔

"آپ مریضوں کو دوا دیا کرنا اور میں ان کی سیوا کیا کروں گی۔ اگر کبھی یوں ہو سکے۔۔۔" ممتا کے چہرے پر ایک چمک پیدا ہوئی جیسے وہ اب بیمار ہی نہیں تھی۔ اب تو وہ مریضوں کی سیوا کر سکتی تھی۔

"کیوں نہیں ہو سکے گا ممتا۔ اسے کون روک سکتا ہے؟" دیو نے بڑے استحکام سے کہا۔

"کوئی بھی نہیں۔ میں یوں ہی ڈر گئی تھی کہ لوگ مجھ سے یہ بھی چھین لیں گے۔" ممتا نے سرد آہ بھری۔

ممتا کی پرانی بیماری اس کے سارے بدن میں گھوم گئی۔ ڈاکٹر دیو اسی بات سے ڈرتا تھا۔ دیو ایک ڈاکٹر تھا اور اُسے معلوم تھا کہ اس نامراد بیماری سے کوئی طاقت نجات نہیں دلا سکتی تھی۔ اُسے صرف ایک ہی آس تھی۔ کہ وہ کھینچ گھسیٹ کر ممتا کی زندگی کے دھارے کو کچھ اور طویل کر سکے گا۔ لیکن مرض کے اس بھیانک حملہ نے ڈاکٹر دیو کی یہ اُمید بھی توڑ دی۔

دیو نے ممتا کو لٹا دیا۔ لیکن ممتا کے منہ سے خون کا ایک فوارہ چھوٹا جس نے اُس کی زندگی کا سانس ہی کھینچ لیا۔ ممتا بیہوش لیٹی رہی۔

ڈاکٹر دیو جوڑ توڑ کرتا رہا۔ رات کو جب منو اور رنجو جنگلی لوگوں کا ناچ

دیکھ کر لوٹے تو ایسا محسوس ہوا جیسے ممتا کے سانس صرف ان کا انتظار کر رہے تھے۔ ممتا نے انہیں دیکھا اور دونوں بچوں کا سر اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ بچوں نے اپنے حلق میں اپنی چیخیں روک رکھی تھیں۔ اور وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔ اب ممتا نے ہاتھ بڑھایا۔ ڈاکٹر دیو نے اپنے ہاتھوں میں اُس کے دونوں ہاتھ لے لئے اور پھر ممتا کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ ممتا کی رگوں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ ممتا نے آنکھیں بند کر لیں اور اُس کی آنکھیں بند رہیں۔

رات کا پچھلا پہر یوں ہی بیت گیا۔ اس وقت کسی نے آ کر ڈاکٹر دیو کے ہاتھوں میں تار پکڑا دیا۔ اس میں لکھا تھا۔

"دیو جی۔ آج جس بہن کو میں نے آپ کی آنکھوں کے ذریعہ کئی برس تک دیکھا ہے۔ اس کے قدموں میں میری عقیدت کے پھول چڑھا دینا۔ راجکماری۔

اس وقت ڈاکٹر دیو کے منجمد جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ اُس نے وہ تار ممتا کے قدموں میں رکھ دیا۔ اب ڈاکٹر دیو کی ہمت جواب دے گئی۔ اس نے ممتا کے مردہ جسم کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

ہماری مطبوعات

ناقابلِ فراموش	دیوان سنگھ مفتوں
کارِ جہاں دراز ہے	قرۃ العین حیدر
آشفتہ بیانی میری	رشید احمد صدیقی
رسیدی ٹکٹ	امرتا پریتم
پیغمبرانِ سخن	سردار جعفری
وے صورتیں الٰہی	مالک رام
ساحر شخص و شاعر	ناز صدیقی
آگ کا دریا	قرۃ العین حیدر
سیتا ہرن	〃
ماں کی کھیتی	〃
آدمی کا مقدر	〃
ڈنگو	〃
آلپس کے گیت	〃
تلاش	〃
کٹاری	سعادت حسن منٹو
ایک گدھے کی سرگذشت	کرشن چندر
الٹا درخت	〃
دادر پل کے بچے	〃
میری یادوں کے چنار	〃
رات چور اور چاند	بلونت سنگھ
چک پیراں کا جسا	〃
ناگ منی	امرتا پریتم
یہ سچ ہے	〃
پنجر	〃
انچاس دن	〃
رنگ کا پتہ	〃
ایک تھی انیتا	〃
ڈاکٹر دیو	امرتا پریتم
بلاوا	〃
دو ہاتھ	عصمت چغتائی
بدن کی خوشبو	〃
افسانے ڈرامے	〃
ایک لڑکی ایک جام	امرتا پریتم
پھول کی تنہائی	کرشن چندر
محبت کی رات	〃
نئے غلام	〃
بلونت سنگھ کے افسانے	بلونت سنگھ
ٹھنڈا گوشت	سعادت حسن منٹو
انارکلی	〃
کالی شلوار	〃
خالی بوتلیں خالی ڈبے	〃
گنجے فرشتے	〃
لاؤڈ سپیکر	〃
نیچے اوپر اور درمیان	〃
پت جھڑ کی آواز	قرۃ العین حیدر
فصلِ گل آئی یا اجل آئی	〃
روشنی کی رفتار	〃
ہاتھ ہمارے قلم ہوئے	راجندر سنگھ بیدی
کندن	〃
بیدی کے افسانے	〃
پانچ برس لمبی سڑک	امرتا پریتم
مضامینِ رشید	رشید احمد صدیقی
خنداں	〃
مضامینِ کرشن چندر	کرشن چندر